تاریخ مرثیہ

ابتدائی دور

ایران میں عزاداری اور فارسی مرثیہ

تصنیف

سید مسعود حسن رضوی ادیب

ناشر

محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ

باتعاون

ولایت فاؤنڈیشن (دہلی)

بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ مرثیہ

ابتدائی دور

ایران میں عزاداری اور فارسی مرثیہ

تصنیف:

سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ

ناشر:

محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ

باتعاون

ولایت فاؤنڈیشن (دہلی)

کتاب کا نام: تاریخ مرثیہ، ابتدائی دور، ایران میں عزاداری اور فارسی مرثیہ

تصنیف: سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ

کمپوزنگ: سید محمد عباس رضوی

ناشر: محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ باتعاون ولایت فاؤنڈیشن (دہلی)

طبع: نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

سال اشاعت: باراول، ستمبر ۲۰۱۵ء، ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

قیمت: ۲۸۰ روپے

تعداد: ۱۰۰۰

ناشر: نور پبلی کیشنز، ۴۲۔۲۸۴۲، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

ISBN : 978-93-85295-07-2

عرض ناشر

صدیقہ کبریٰ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی سبق آموز، عہد آفرین اور دشمن شکن شخصیت کی آغوش تربیت کا اثر کربلا ہے۔ کربلا، فاطمی مکتب کا آئینہ ہے۔ وہ لوگ بڑی غفلت میں ہیں جو میر کاروان عشق حسینؑ اور شریکۃ الحسینؑ زینب علیا مقام کو کسی خاص حادثہ کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ کربلا کی بنیادوں میں فاطمی خون جگر، اس کی رگ و پے میں شیر فاطمی کا اثر اور اس کی انقلاب آفرینی میں نان جویں کا شرر موجزن ہے۔

کربلا ایک تسلسل ہے محیط دوراں کربلا جرئت انکار ہے پیش سلطاں
کربلا خرمن سرمایہ پہ ہے برق تپاں کربلا طبل پہ ہے ضربت آواز اذاں
فکر حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

کربلا کا سب سے اہم درس جبر کا صبر سے مقابلہ ہے۔ سرکار سید الشہدا حضرت امام حسین نے اسلامی سماج و معاشرے بلکہ ساری انسانیت کو گمراہی کی ڈگر سے بچا کر راہ راست اور الٰہی راستے پر لانے کے لئے یہ تمام قربانیاں پیش کیں اور صعوبات سفر کو برداشت کیا۔ زینب کبریٰؑ نے قید و بند کی مصیبتیں، راہ کوفہ و شام کی صعوبتیں اور یتیم بچوں کی بے پناہ پریشانیاں اور سسکیاں فقط اور فقط انسانیت کو انحرافی ڈگر سے نجات دینے کے لئے برداشت کیں۔

یہ تمام شجاعت، نجابت، شہامت، صلابت اور دیانت و دلسوزی ان بھائی بہن نے اپنی ماں سے سیکھا تھا۔ اگر بعد رسولؐ اٹھنے والے فتنے اور انحراف کے مقابلہ میں صدیقۂ طاہرہ خاموش رہ جاتیں تو

زینب و حسین علیہما السلام کو ظلم سے مقابلہ کا درس کہاں سے ملتا۔

یہ صدیقۂ طاہرہ کے انقلاب اور جبت و طاغوت سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ہی اثر تھا جس نے قہرمانان کربلا کے اعمال کو ہمیشہ کے لئے انقلاب کی علامت بنا دیا۔ اگر صدیقۂ طاہرہ نے اپنے خطبہ سے ایوان جبر کو لرزہ براندام نہ کر دیا ہوتا تو کوفہ و شام کے بازار و دربار میں ثانی زہراؑ کے خطبہ سے زلزلہ برپا نہ ہوتا۔ یہ فاطمی انقلاب اور ظالم حکمراں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جبت و طاغوت کی حقیقتوں کو فاش کرنے کا اثر تھا کہ دربار ابن زیاد میں اسد اللہ کی جائی نے روباہ صفت پسر زیاد کے اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لہٰذا احیائے فاطمیہ در واقع احیائے عاشورا کا مقدمہ ہے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے کربلا کو راہ حق و حقیقت کے علامتی کردار میں تبدیل کر دیا، جس میں عزاداری اور منظوم نذرانۂ عقیدت کا بڑا اہم کردار ہے۔

ماضی میں شعرائے کرام کے حماسی اور بکائی اشعار سماج و معاشرے میں وہی کام کرتے تھے جو آج میڈیا کرتا ہے۔ میڈیا کو خریدنے کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ حکمراں جماعت نے ہمیشہ میڈیا کو خرید کر اپنے قبضہ میں رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ سنہرے روپہلے سکوں کی موسلا دھار بارشوں اور خوف و ہراس کی یلغار نے اکثر جرئت گفتار اور قوت اظہار چھین لی۔ وہی لکھا گیا جسے حکومت کی چشم و ابرو کی حرکت نے پسند کیا۔

لیکن سیدہ عالمیان کے "صبت علی مصائب..." کی قسم! آنسوؤں اور مرثیہ کی شکل میں اعلان مظلومیت اور ابطال باطل کا جو طریقہ سیدۃ نساء العالمین نے اختیار کیا وہ اظہار مظلومیت کا ایسا سنگ میل قرار پایا کہ ان کی نسل طیبہ نے اسی کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا وہ کربلا میں سرکار سید الشہداؑ کے آنسو ہوں یا راہ کوفہ و شام میں صدیقہ صغریٰ زینب کبریٰؑ کے دل سوز بیان، مصائبِ زین العبادؑ کے اتھاہ آنسو، نالہ و شیون ہوں یا زندان شام میں کسی بچی کی فریاد "مدینة جدنا لا تقبلین" کا مبکی مرثیہ ہو یا ہاشمی خواتین کا گریباں چاک کرنا ہو سب کے سب اسی مرثیہ "صبت علی..." کی تاسی ہیں۔

ائمہ اطہار کو جب بھی موقع ملا انہوں نے اعلان مظلومیت کے لئے اس انمول اور اچھوتے طریقہ کو پوری توانائی کے ساتھ استعمال کیا۔ قریحہ شعری اور موزوں طبع شاگردوں کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے لئے ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کے ثواب کو یہ کہہ کر لازوال کر دیا کہ ''ہر بیت پر جنت میں ایک بیت ملے گا'' اب کیا تھا فرزدق حاکم وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حاجیوں کے درمیان فضائل کے موتی بکھیرنے لگے، حکمراں جماعت سے بے خوف دعبل خزاعی کا قصیدہ لامیہ اتنا زباں زد خاص وعام ہوا کہ ایک دومہینہ کے اندر اندر لٹیرے بھی اسے گنگنانے لگے۔

زمانہ بدلتا گیا، حکومتوں کے شکنجوں اور اظہار مظلومیت کے نتیجے میں قید خانہ کی کال کوٹھریاں آباد ہونے لگیں لیکن فاطمی جیالوں اور حسینی متوالوں نے فاطمی انداز کو فراموش نہیں کیا بلکہ یہی مرثیہ حکومتوں کے زوال اور مظلوموں کے کمال کا سبب بنا۔ تاریخ نے ایک بار کروٹ لی اور مظلوموں اور مستضعفین کے احقاق حق کے لئے ایران میں آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ کی قیادت میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ ابتدائی دنوں میں ہی اس عاشق زہراؑ نے فرمادیا کہ ''محرم وصفر کی حفاظت کرو ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اسی محرم وصفر کا نتیجہ ہے''۔

ایران میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ گوئی کی تاریخ ہمارے استاد آیت اللہ شیخ احمد عابدی کے بقول تشیع کے ہمزاد ہے۔ لیکن ایرانی انقلاب نے جو اس کا رخ موڑا ہے اس نے تاریخ کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ جنہیں رونے رلانے والی قوم سمجھا جاتا تھا یعنی کمزور، ناتواں اور دبے، کچلے انہوں نے ہی ظالم حکمرانوں کی کج کلاہی کو پیروں تلے روند دیا۔

سمجھ رہا تھا زمانہ یہ قوم گریہ کناں رہین شیون و ماتم اسیر وہم و گماں
نہ تیغ اٹھے گی اس سے نہ چل سکے گی سناں بھلا یہ قوم کہاں اور انقلاب کہاں
مگر اٹھی تو ستم کا مزاج پھینک دیا
اتار کر سر ظالم کا تاج پھینک دیا

اس انقلاب نے طاغوتی طاقتوں اور شیطانی قوتوں کے موالیوں کی نیندیں حرام کردیں۔ انھوں نے اسے مٹانے کی بھرپور کوشش کی لیکن مرثیہ نے پھر میدان سنبھالا، آنسو پھر محاذ پر سامنے آیا ماؤں نے مرثیہ پڑھ پڑھ کر اپنے گود کے پالوں کو اسلام کی راہ میں قربان کردیا۔ پھر یہ اشعار ایک نئے انداز میں گنگنائے جانے لگے۔

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالم است

باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

اس بنیاد پر ایران کی تاریخ مرثیہ نگاری کا ایک غائرانہ مطالعہ نہایت ضروری ہے تاکہ اس کے تناظر میں ایران میں جدید مرثیہ اور اس کے عالمی اثر پر دیدہ ریزی اور باریک بینی کے ساتھ تحقیق کی جاسکے۔

اس فکر میں ہمارے بزرگ ہم سے پیش رو ہیں انہوں نے کئی برس قبل ایران کی تاریخ مرثیہ نگاری کی اہمیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا اس لئے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس تحقیق کو سینہ قرطاس پر ثبت کردیا۔ اس انمول اثر کا سہرا بھی اسی کے سر ہے جس نے انیسؔ شناسی کو اردو ادب کا جزوِ لاینفک بنادیا اور میر انیسؔ پر جس کی تحریریں آج بھی حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس وادی میں اکلوتا نام پروفیسر مسعود حسن ادیب اعلی اللہ مقامہ کا ہے پھر ان کے آثار و کردار اور عادات واطوار کے جانشین پروفیسر نیر مسعود ہیں۔

پروفیسر ادیب کی شخصیت کسی بھی صاحب علم وادب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے فرزند سے لے کر آج کے اکثر نامور ادبائے کرام انہی کے دسترخوان علم وادب کے نمک خوار ہیں۔

پروفیسر ادیب کی تالیفات بھی بہت زیادہ ہیں۔ انہیں میں سے ایک موجودہ تحریر ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو ابھی تک قلمی نسخہ کی صورت میں تھی جب کہ بڑے بڑے لوگ اس کی اشاعت کے منتظر تھے لیکن بقول پروفیسر نیر مسعود کے کہ وہ سب کے سب اس تمنا کو دل میں لئے پیوند خاک ہوگئے۔

ایک ملاقات میں مہربان اور شفیق پروفیسر صاحب نے اس کتاب کا تذکرہ کیا۔ میں نے دیکھنے کی

خواہش کی۔ برادر عزیز تمثال مسعود نے وہ مسودہ دکھایا تو وہ میں نے ان سے لے لیا۔ پھر ٹائپ کا مرحلہ سنگین تھا۔ کسی کہنہ مشق اور تعلیم یافتہ شخص سے ہی یہ کام ہو سکتا تھا جسے ادارہ کے اہم مخلص حجۃ الاسلام و المسلمین سید محمد عباس رضوی صاحب نے انجام دیا۔ ٹائپ شدہ مسودہ کی تصحیح، تطبیق اور پروف ریڈنگ اس سے زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ کسی ایسے ماہر کی ضرورت تھی جو بیک وقت فارسی اور اردو دونوں پر عبور رکھتا ہو۔ جب خدا کا کرم ہوتا ہے تو راستے خود بخود کھلتے ہیں۔ پروفیسر سید حسن عباس رضوی صدر شعبہ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی سے اس سلسلے میں گزارش کی گئی اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود بغیر کسی داد و دہش کے انہوں نے اس اہم ذمہ داری کو سنبھالا اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس اہم کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

یہ بھی خواہش ہوئی کہ ایک تحریر خود نیر مسعود صاحب کی بھی اس کتاب میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان کی علالت کو دیکھتے ہوئے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

نیر مسعود صاحب ایک ادیب کے فرزند اور زیور علم و عمل سے آراستہ ہیں ان کا ادبستان اسم با مسمی ہے۔ ان کے دستر خوان علم و ادب کے معترف نمک خواروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

محبان ام الائمہؑ اس نعمت باری پر بارگاہ ایزدی میں نہایت شکر گزار ہے کہ اسے مہربان، شفیق اور حوصلہ افزا بزرگان علم و ادب کی سرپرستی اور مشورت حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب آج سے چھ سال قبل شش ماہی ام الائمہؑ کی پہلی اشاعت کے لئے مشورہ کی خاطر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو پہلی ملاقات ہونے کے باوجود ایسے والہانہ، مشفقانہ اور پدرانہ انداز سے ملے کہ جیسے برسہا برس کی ملاقات ہو اور دنیا کا سب سے بڑا عالم میں ہی ہوں، جب کہ: ''من آنم کہ من دانم'' ایسے حوصلہ افزا ماحول میں تو انسان ایک دو نہیں دس مجلات کی اشاعت پر کمر ہمت باندھ سکتا ہے، ستھری زبان، ستھرا مزاج، تصنع اور بناوٹ سے دور گفتگو میں محبت و عطوفت کا امتزاج ایسا مسحور کن تھا کہ میں نے صدیقۂ طاہرہ کے سلسلے میں ایک مقالہ کی درخواست کر دی۔ فرمانے لگے: ''میرے والد نے کہا تھا کہ بیٹا جس میں تم کو مہارت نہ ہو اس میں کبھی قدم نہ رکھنا''۔ میں نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔ میں شہزادی

کے سلسلے میں کچھ بھی لکھنے کی سکت نہیں رکھتا۔ وہ میری اوقات سے ماوراہیں۔ میرا اصرار بڑھتا رہا لیکن ان کا انکار اپنی جگہ ثابت قدم رہا۔ ہار مان کر میں نے جناب حیدر زیدی (اناؤ) کے مشورہ سے عرض کیا کہ اچھا ''حضرت فاطمہؑ انیسؔ کے کلام میں'' کے حوالہ سے کچھ لکھ دیجیے تو اسے قبول کرلیا۔

اس کے بعد تو آپ مجلّہ ام الائمہؑ کے مسلسل قاری اور اس کے سرپرست مشاوروں میں ہوگئے۔ انہی محبتوں اور شفقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سخت علیل ہونے کے باوجود میں نے کچھ تحریر کرنے کی درخواست کردی۔ لکھ تو نہ پائے لیکن املا کردیا اور میں نے تحریر کرلیا۔ احوال واقعی کے عنوان سے وہ تحریر اس کتاب میں موجود ہے۔

برادرم مکرم ڈاکٹر تمثال مسعود نے بھی اس مسودہ کی فراہمی اور مسلسل حوصلہ افزائی کے ذریعہ اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑا ساتھ دیا۔

ادارہ تمام ساتھیوں، معاونین اور کسی بھی طرح اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کرنے والوں خاص طور پر ولایت فاؤنڈیشن (دہلی) کا تہہ دل سے ممنون ہے کہ جس کے مالی تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آرہی ہے۔ امید ہے کہ مکتب فاطمی کی ترویج اور اردو فارسی ادب کی سنگت کو چار چاند لگانے میں یہ کتاب مددگار ثابت ہوگی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سید مراد رضا رضوی

محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ

(شعبہ تحقیق ادارہ نشر واشاعت)

احوال واقعی

پروفیسر نیر مسعود
(سابق صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

ایران میں مرثیہ نگاری یہ ہمارے والد صاحب نے بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ مگر نہیں معلوم اس کے ساتھ کیا منحوسیت لگ گئی کہ وہ اب تک چھپ نہیں سکی۔ حالانکہ اس کی طباعت سے بہت سارے لوگوں کو دلچسپی تھی۔ کرنل بشیر حسین زیدی، مالک رام اور دیگر بزرگ شخصیات اس کے چھپنے کے بے حد منتظر تھے۔ اب امید ہے کہ محبان ام الائمہ تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ کی جانب سے یہ عظیم الشان کتاب منظر عام پر آجائے گی۔ یہ ادارہ مذہبی اور ادبی خدمات بے لوث انجام دے رہا ہے۔ اس کا ششماہی مجلّہ ام الائمہؑ خود ایک علمی ادبی سرمایہ ہے۔

امید ہے کہ آئندہ اور ترقی کے مراحل طے کرے گا جن لوگوں کو اس کتاب کی اشاعت کے حوالہ سے بڑی دلچسپی تھی وہ سب رخصت ہو گئے اب موجودہ نسل کے سامنے والد ماجد کی یہ عظیم محنت منظر عام پر آرہی ہے۔ جو یقیناً علم دوست اور ادبی ذوق رکھنے والے افراد کے لئے ایک علمی ادبی سرمایہ ہوگا۔

میں بھی بستر علالت پر داعی اجل کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوں۔

طالب دعا

پروفیسر نیر مسعود

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ

پروفیسر سید حسن عباس

بالا ی سر ش ز ہوش مندی می تافت ستارہ بلندی

اردو کے نام ور محقق بالخصوص انیس شناس اور ڈراما شناس پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کا تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ ان کے مورث اعلی کا تعلق ایران کے معروف شہر نیشاپور سے تھا جو ہندوستان آ گئے تھے۔ یہاں ان کا وطن ضلع اناو کا قصبہ نیوتنی تھا۔ آپ کے والد حکیم سید مرتضی حسین ایک ذی علم بزرگ اور حکیم حاذق تھے۔ انھوں نے بہرائچ میں اپنا مطب قائم کیا تھا۔ یہیں ۲۹ر جولائی ۱۸۹۳ مطابق ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ کو ادیب صاحب نے اس جہان رنگ و بو میں قدم رکھا۔ والد صاحب انھیں طبیب اور عالم دین بنانا چاہتے تھے اس لیے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم شروع کی لیکن ناگہانی طور پر ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ر کو والد کا سایہ سر سے بہت جلد اٹھ جانے کے سبب معاشی اور اقتصادی مسایل کھڑے ہو گئے۔ لیکن ان کی والدہ کی سرپرستی نے انھیں تعلیم کے حصول میں سرگرم رکھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں ادیب لکھتے ہیں:

> جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا یعنی میری عمر کے پانچویں سال پانچویں مہینے پانچویں دن میری بسم اللہ ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم ہونے لگی۔ میرے والد مجھ کو اپنے نقش قدم پر چلانا اور طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم بنانا چاہتے تھے مگر میں ابھی صرف دس برس پانچ مہینے کا تھا

کہ ان کی ناوقت وفات نے میری تعلیم کا رخ بدل دیا۔

والد کے انتقال کے باعث جن حالات کا سامنا انھیں کرنا پڑا اس کی منظر کشی خود کی ہے، لکھتے ہیں:

والد کے انتقال کے بعد چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عزیزوں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ میرے تعلیمی مصارف کا بار اٹھاتا۔ مالی اعانت کا کیا ذکر، خالی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا۔ تحصیل علم کے شوق کی آگ جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی، وہ افسردگی کے عالم میں ضرور بجھ کر رہ جاتی اگر میری والدہ مرحومہ کی مردانہ ہمت اسے بھڑکاتی نہ رہتی۔

۱۹۰۸ء میں مڈل پاس کر کے لکھنو کا رخ کیا اور ۱۹۱۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم اور گھریلو مسایل کے پیش نظر انھیں معمولی کام بھی کرنا پڑا۔ گرمی کی تعطیل میں کام کیا۔ پہلے افیون کے محکمے میں پھر کچہری میں کام کیا۔ تعطیلات ختم ہونے کے بعد کیننگ کالج لکھنو میں داخل ہوے۔ ۱۹۱۵ء میں انٹر اور ۱۹۱۷ء میں بی اے کیا اور ایم اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ لیکن علالت کے سبب سال اول کا امتحان نہ دے سکے۔ ۱۹۱۸ء میں محکمہ تعلیمات الہ آباد میں ملازمت سے منسلک ہوے جہاں مختلف موضوعات پر مختلف زبانوں میں مطبوعہ کتابیں آتی تھیں جنھیں پڑھ کر انھیں تبصرہ کرنا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ادیب صاحب لکھتے ہیں:

"...صوبہ متحدہ کے سررشتہ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی، جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبہ میں جتنی کتابیں چھپیں، ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے صوبے کے سرکاری اخبار (یو پی گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے۔ اور جمہور کے خیالات کا رجحان دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کر اس رپورٹ کے

لیے سامان فراہم کیا جائے جو سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہر سال گورنمنٹ
کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں اس جگہ میرا تقرر ہو گیا اور دس
برس کے مسلسل قیام کے بعد مجھے بادل ناخواستہ لکھنو چھوڑ کر الہ آباد
رہنا پڑا۔ کوئی ساڑھے تین سال اس جگہ پر میں نے کام کیا۔ اس زمانے
میں صوبۂ متحدہ میں ہر سال ڈھائی ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔ اس طرح اس
ملازمت کی بدولت مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں
میری نظر سے گذریں۔"

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ادیب صاحب کے مطالعے میں وسعت پیدا ہوئی اور ان میں تصنیف و تالیف کا شوق ہوا۔

۱۹۲۱ء میں ملازمت سے رخصت لے کر ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے ال۔ ٹی کی سند لی۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں تقرری عمل میں آئی۔ لیکن اردو زبان سے والہانہ عشق اور علم و ادب کی خدمت کے شوق میں لکھنو میں رہنا ان کے لیے ضروری تھا۔ لکھتے ہیں:

"اس ملازمت کے صرف چالیس دن بعد جب لکھنو یونیورسٹی میں
جونیر لکچرر کی جگہ مجھ کو دی گئی تو میں نے تمام مالی منفعتوں اور منصبی ترقیوں
کے امکانات کو نظر انداز کر دیا اور سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر
یونیورسٹی کی ملازمت بہ خوشی قبول کر لی"۔

لکھنو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں ۳۲ برس بہ حیثیت استاد اور ۲۴ برس صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵ رجون ۱۹۵۴ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ادیبؔ کے ایک شاگرد رشید پروفیسر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ

"پروفیسر مسعود حسن مدت تک لکھنو یونیورسٹی کے فارسی و اردو شعبے

کے صدر رہے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں جو ماحول بنایا اور جو ساتھی شعبے میں جمع کیے، وہ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں نہیں تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر محمد حسن وغیرہ ان میں سے ہر ایک نے عالمی شہرت حاصل کی۔ اگرچہ اس صورت کے پیدا کرنے میں ہر ایک کی اپنی ذاتی صلاحیت کا دخل ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اس علمی فضا کا بھی دخل ہے جو مسعود حسن رضوی کی کوشش سے یونیورسٹی میں پیدا ہوئی تھی۔'

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی تدریسی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

پروفیسر رضوی صاحب بڑے کامیاب استاد تھے۔ ان کی تدریس کا طریقہ کافی موثر تھا۔ پڑھاتے وقت زبان و ادب کے ایسے نکات بیان کرتے کہ طلبہ میں تنقید اور سخن فہمی کی صلاحیت پیدا ہوتی۔ نظم ہو یا نثر دونوں میں بڑی دلچسپی پیدا کرتے۔ نکتے میں نکتہ پیدا کرنا ان کا شعار تھا۔ جدید فارسی میں دو کتابیں ان سے پڑھیں۔ ایک تحقیقی کارنامہ 'بیست مقالۂ قزوینی' اور دوسرا تخلیقی ادب کا شاہکار 'رہبر نثر ادبِ نو' دونوں کو اس عالمانہ انداز میں پڑھایا کہ اس کا ہلکا سا تصور آج بھی باقی ہے۔ عرفیؔ کی غزلیات پڑھاتے وقت ایسے ایسے نکتے بتاتے کہ فارسی غزل سے دلچسپی پیدا ہو جاتی۔'

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی کتب بینی اور وسعت مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے فرزند ارجمند اور اردو کے معروف محقق پروفیسر نیر مسعود لکھتے ہیں، اقتباس ذرا طویل ہے لیکن رضوی

صاحب کی علمی ادبی شخصیت کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے:

...انھوں نے اردو فارسی ادب کی تاریخ، قواعد، عروض، بیان و بدیع ، اسالیب نظم ونثر اور ہندوستان اور ایران کی سیاسی اور سماجی تاریخ وغیرہ کا با ضابطہ اور عالمانہ مطالعہ کرنے میں بے حد محنت کر کے اپنی صحت جو پہلے بھی اچھی نہیں تھی اور بگاڑ لی۔ اس سلسلے میں جن کاغذوں پر انھوں نے نوٹ بنائے اور مشقیں کیں تھیں، ان کا ایک بڑا انبار ہو گیا تھا۔ ہندی زبان انھوں نے الہ آباد میں ایک پنڈت جی کو ملازم رکھ کر سیکھی تھی اور ان کو ہندی ادبیات خصوصاً تلسی داس کی رامائن پر خاصا عبور حاصل تھا۔ انگریزی میں ان کی استعداد اسکول کے زمانے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ یونیورسٹی کی طالب علمی کے دوران ان کی انگریزی دانی کی بڑی شہرت تھی اور پروفیسر کیمرن وغیرہ کے سے اساتذہ ان کے لکھے ہوئے مضامین دوسرے طلبہ کو مثالی انگریزی کے نمونے کے طور پر پڑھ کر سناتے تھے۔ مسعود صاحب نے فلسفے، منطق اور نفسیات کا بھی اچھا مطالعہ کیا تھا۔ وہ عربی بھی پڑھے ہوئے تھے اور بچپن میں عربی کے بہت اچھے طالب علم تھے لیکن اس زبان کا مطالعہ وہ جاری نہ رکھ سکے چنانچہ عربی عبارتیں سمجھ لینے کے باوجود خود کو عربی داں شمار نہیں کرتے تھے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی شادی ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھی۔ ان کی اہلیہ نہ صرف یہ کہ تعلیم یافتہ تھیں بلکہ انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کی تھی جس کا اُس زمانے میں رواج نہیں تھا۔ شاعرہ بھی تھیں اور حزیںؔ تخلص کرتی تھیں بقول نیر مسعود:

''اتفاق سے میر انیسؔ کا ابتدائی تخلص بھی (بہ روایتے) حزیںؔ تھا۔ بیگم

مسعود کلام انیسؔ کی حافظ تھیں اور بلا تامل بتا دیتی تھیں کہ انیسؔ کا کون سا بند، کس مرثیے میں اور وہ مرثیہ کون سی جلد میں ہے''۔

یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جون ۱۹۳۳ء میں ایران و عراق کا سفر کیا اور وہاں کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوے۔ اس سلسلے میں خود ادیبؔ رقم طراز ہیں:

''مدت سے اس سرزمین کی زیارت کا اشتیاق تھا جو صدیوں تک تمام عالم اسلامی کے لیے تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکی ہے اور جس کا اثر آج تک ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جب فارسی ادب اور اس کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ فرائض منصبی میں داخل ہو گیا تو اس دیرینہ اشتیاق نے ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی میں جون ۱۹۳۳ء میں ایران کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے راستے سے اُس ارض حسن و شعر میں داخل ہوا اور زاہدان، بیرجند، تربتِ حیدری، مشہد مقدس، طوس، نیشاپور، سبزوار، سمنان، دامغان، تہران، شاہ عبدالعظم، قم، اصفہان، تخت جمشید وغیرہ کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا۔ ابھی سیاحت ایران کا نصف پروگرام بھی پورا نہ ہوا تھا مگر مسلسل سفر کی تکلیفوں سے تھک کر میں نے بوشہر کا رخ کیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر بصرے پہنچا اور عراق عرب کے مشہور شہروں کی سیر اور وہاں کے عتباتِ عالیات کی زیارت کر کے بحری راستے سے ہندوستان واپس آ گیا''۔

ادیبؔ کا ایک شوق پرانی کتابوں اور مخطوطات کی جمع آوری بھی تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے انھوں نے برسوں لکھنؤ کی تنگ و تاریک گلیوں اور کوچہ و بازار کی خاک چھان کر بیش بہا ذخیرہ خاص کر رثائی ادب کا ذخیرہ اکٹھا کر لیا۔ ان کے جمع کردہ مطبوعات و مخطوطات میں کئی اہم اور نادر مخطوطات

شامل ہیں جن کے دوسرے نسخے نہ صرف کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔لکھنوی مرثیہ گویوں خاص کر میر انیسؔ سے انھیں بے پناہ دل چسپی اور عقیدت تھی۔اسی طرح واجد علی شاہ اور ان کے آثار سے بھی ان کو گہری دل چسپی تھی۔انھوں نے مذکورہ دونوں اہم شخصیات پر ڈوب کر تحقیقی کام کیے ہیں۔اب انھیں تحقیق کی راہ میں آگے بڑھنا تھا لہٰذا نت نئے موضوعات پر نگارشات نے ادبی حلقے کو ان کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح ان کی حیثیت ناقد سے زیادہ محقق کی بنتی چلی گئی۔اس بارے میں نیر مسعود لکھتے ہیں:

> ''ذاتی ذخیرے کی کتابوں میں اضافے اور مطالعے کی وسعت کے ساتھ ساتھ مسعود کا مزاج ادبی اور تنقیدی سے زیادہ علمی اور تحقیقی ہوتا گیا اور وہ آہستہ آہستہ نقاد اور نثار کے بجائے محقق ہو گئے''۔

مسعود حسن رضوی ادیب، رثائی ادب کے شناور بالخصوص ماہر انیسیات کے طور پر منفرد مقام کے حامل ہیں۔اسی کے ساتھ انھوں نے مرتب متن کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔غالب اور متعلقات غالب سے دل چسپی رکھتے تھے۔تذکروں کا مطالعہ ادبی اور علمی تحقیق کے لیے بنیادی شرط سمجھا جاتا ہے۔اس میدان میں بھی ادیب پیچھے نہیں رہے۔سلطان عالم واجد علی شاہ کی شخصیت اور خدمات کے ساتھ اردو ڈراما نگاری اور لکھنو کے شاہی اسٹیج جیسے موضوعات پر جس طرح ادیب نے دادِ تحقیق دی ہے وہ بہت کم کسی کے حصے میں آئی ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے مستقل کتابوں کے علاوہ سیکڑوں علمی، ادبی، تحقیقی مضامین کے ذریعے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔وہ اودھ کی قدیم تہذیب اور اس کے نہایت معتبر پارکھ کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے تھے۔لہٰذا اودھ کی تاریخ و تہذیب اور ادب پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اس خطۂ مینو سواد پر ذی قیمت مضامین سپردِ قلم کیے ہیں، وہ ان ہی جیسے باکمال محقق سے ممکن تھا۔لکھتے ہیں:

"مجھے لکھنؤ سے اس مرحوم لکھنو سے جو ہمارے علوم وفنون کا سر چشمہ، ہماری تہذیب وتمدن کا مرکز اور ہماری زبان وادب کی ٹکسال تھا قلبی محبت ہے اور اس کی علمی وادبی خدمتوں کو منظر عام پر لانے میں مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔"

ادیب صاحب نے اردو کے استاد، ناقد اور محقق کے ساتھ انیس شناسی کے باب میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اس سے ہمارا علمی حلقہ نہ صرف بخوبی واقف ہے بلکہ معترف بھی ہے اور ان عظیم خدمات کی انجام دہی، اُس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک موضوع سے گہری دل چسپی یا وابستگی بلکہ عشق نہ ہو۔ انھیں انیس سے عشق تھا۔ انھوں نے انیس اور متعلقات انیس کے ساتھ رثائی ادب کے مختلف معلوم اور نا معلوم گوشوں پر اپنے گہرے اور وسیع مطالعے کے سبب تحقیق وتنقید کی ایسی شمعیں روشن کی ہیں جس میں کوئی دوسرا ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں امتحان وفا، منظر عام پر آئی تھی، اُس وقت سے لے کر تادم آخر بیسیوں کتابیں ان کی تحقیق کی بدولت معرض وجود میں آئیں اور سب کی سب اپنے موضوع پر حرف آخر نہیں تو اس سے کچھ کم بھی نہیں ہیں۔ صرف اُن کی کتابوں کے ناموں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر وسیع اور عمیق فکر ونظر کا نتیجہ ہیں۔ 'ایران میں مرثیہ نگاری' کے ہی موضوع کو لیجیے۔ ابھی تک اردو کیا فارسی کے بھی کسی مورخ ومحقق نے اس موضوع پر اس جیسا تو دور کی بات ہے، اس سے کم تر درجے کی کتاب بھی تالیف کرنے کی ہمت نہیں جٹائی تھی مگر پروفیسر ادیبؔ نے جس محنت ومشقت، تحقیق وتفتیش اور وسیع مطالعے کے سہارے اس اہم علمی خدمت کو انجام دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قارئین کے دلوں پر ان کی محققانہ حیثیت کے نقش کو مزید گہرا بناتا ہے۔ یہ ان کا شاہکار علمی کام ہے اور اس کام کے لیے جتنی ضروری چیزوں کی ضرورت ہوسکتی تھی وہ سب ان میں موجود تھیں۔ اس کتاب کے لیے انھوں نے تحقیق وجستجو کی جن خارزار راہوں کو طے کیا ہے، وہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ بات صرف اسی کتاب کی حد تک محدود نہیں بلکہ ان

کے تمام علمی تحقیقی کاموں کے بارے میں یہی خیال گذرتا ہے۔

ہماری زبان اور ادب کے لیے یہ نہایت مسرت و اطمینان کی بات ہے کہ ہمارے جتنے نمایاں محقق حضرات ہیں، ان میں پروفیسر ادیبؔ کی شخصیت اپنی وسیع علمی خدمات کے پیش نظر کچھ جدا اور منفرد آن بان کی حامل نظر آتی ہے۔ جس طرح ان کی شخصیت انتہائی مہذب و محتاط تھی اسی طرح وہ تحقیق کے میدان میں بھی ممتاز محققین میں سرفہرست شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے کارناموں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ پروفیسر ادیبؔ نے کتنی جانفشانیوں کے بعد اپنی تصانیف و تالیفات کے ذریعے اردو ادب کے سرمائے میں کتنا عظیم اضافہ کیا ہے۔ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء کو اردو کا یہ نامور محقق اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا اور اپنے پیچھے اپنے وسیع مطالعات کی ایک دنیا چھوڑ گیا جو ہمارے لیے راہنما ہیں۔

پروفیسر ادیبؔ کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست براساس اشاعتِ اول پیش خدمت ہے۔ بعض بعض کتابوں کے کئی کئی اڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔

۱۔ امتحان وفا ۱۹۲۰ء — ۲۔ دبستان اردو ۱۹۲۵ء
۳۔ ہماری شاعری ۱۹۲۷ء — ۴۔ فرہنگ امثال ۱۹۲۸ء
۵۔ مجالس رنگیں ۱۹۲۹ء — ۶۔ فیض میر ۱۹۲۹ء
۷۔ نظام اردو ۱۹۳۱ء — ۸۔ روح انیس ۱۹۳۱ء
۹۔ جواہر سخن ۱۹۳۱ء — ۱۰۔ شاہکار انیس ۱۹۳۹ء
۱۱۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز ۱۹۴۶ء — ۱۲۔ متفرقات غالب ۱۹۴۷ء
۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم الخط ۱۹۴۸ء — ۱۴۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۵۴ء
۱۵۔ لکھنو کا شاہی اسٹیج ۱۹۵۷ء — ۱۶۔ رزم نامہ انیس ۱۹۵۷ء
۱۷۔ تذکرۂ نادر ۱۹۵۷ء — ۱۸۔ فسانۂ عبرت ۱۹۵۷ء

۱۹۔لکھنو کا عوامی اسٹیج ۱۹۵۸ء ۲۰۔اردو ڈراما اور اسٹیج ۱۹۵۸ء

۲۱۔آئینۂ سخن ۱۹۵۹ء ۲۲۔گلشن سخن ۱۹۶۵ء

۲۳۔ایرانیوں کا مقدس ڈراما ۱۹۶۶ء ۲۴۔قواعد کلیہ بھاکا ۱۹۶۸ء

۲۵۔اندر سبھا ۱۹۶۸ء ۲۶۔شاعر اعظم انیس ۱۹۶۹ء

۲۷۔نگارشات ادیب ۱۹۶۹ء ۲۸۔اسلاف میر انیس ۱۹۷۰ء

۲۹۔شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب ۱۹۷۴ء

۳۰۔سلطان عالم واجد علی شاہ ۱۹۷۴ء

۳۱۔انیسیات ۱۹۷۶ء ۳۲۔نقد انیس ۲۰۰۴ء

جن کتابوں کی مدد سے یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مسعود حسن رضوی ادیب۔حیات وخدمات؛ مولفہ: مرزا جعفر حسین، نامی پریس لکھنو ۱۹۷۷ء

(۲) مسعود حسن رضوی ادیب۔فرد اور فنکار، مرتب: سبط محمد نقوی، سرفراز قومی پریس لکھنو، ۱۹۸۰ء

(۳) نیا دور لکھنو (مسعود حسن نمبر) مارچ-اپریل ۱۹۷۷ء

(۴) غالب نامہ دہلی (سید مسعود حسن رضوی ادیب نمبر)، مدیر اعلیٰ: پروفیسر نذیر احمد۔جنوری ۱۹۹۳ء

(۵) سید مسعود حسن رضوی ادیب (کتابیات) از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

مقدمہ

آیت اللہ شیخ احمد عابدی مدظلہ العالی

(وائس چانسلر علوم و معارف قرآن کریم یونیورسٹی)

عزاداری ایک انسانی فطرت ہے جب بھی کوئی اپنے کسی عزیز کی جدائی کا داغ اٹھاتا ہے چاہے وہ عزیز انسان ہو یا غیر انسان تو اس کی جدائی سے ایسا متاثر و غمگین ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ عزاداری جدا ہونے والی چیز کے سلسلہ میں افسوس کرنے کا نام نہیں ہے۔ ہاں! حزن و ملال ضرور ہے۔

اخلاق کی ایک بہت ہی اچھی صفت ''گداز قلب'' اور شقاوت سے اجتناب ہے۔ آنکھوں کا جمود اور گریہ نہ کرنا اخلاقی نکتہ نگاہ سے مذموم اور اخلاقی رذائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ ممدوح کے لئے اشک یا بکا، ایک بہت ہی عظیم فضیلت ہے۔

درحقیقت آنسو، عزاداری، سیاہ لباس پہننے اور مرثیہ کے ذریعہ ہر انسان کا دوسرے کی مصیبت میں اپنی شرکت کو نمایاں کرنا ہے۔ غم میں یہ مشارکت مصیبت زدہ لوگوں کی تسلی و تسکین کا سامان قرار پاتی ہے۔ مصیبت زدہ افراد کے ساتھ ہمدردی ان کی تسکین اور تسلی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

دوسری طرف کسی مظلوم پر عزاداری کرنا ایک قسم کی فریاد، اعتراض اور ظالم کے خلاف اظہار غیض و غضب ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظالم اور طاغوتی طاقتیں ہمیشہ مجالس عزاداری سے پرہیز کرتے

ہوئے اس سے وحشت زدہ اور مضطرب دکھائی دیتی ہیں اور کسی نہ کسی طرح اسے روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ مجالس عزا ہمیشہ ظالموں اور سامراجی طاقتوں کے خلاف شورش، قیام اور انقلاب کا سبب ہیں۔

امام حسین علیہ السلام پر عزاداری، آزادگی، جواں مردی اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے سر نیاز خم نہ کرنے کا درس ہے۔ امام حسین علیہ السلام حق اور اخلاقی اقدار سے دفاع اور ظلم واستبداد سے مقابلہ کے لئے نمونہ عمل ہیں۔

عزاداری اگر غمزدہ ہونے اور آنسو بہانے کی صورت میں ہو تو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ لیکن عزاداری اگر سیاہ لباس پہننے یا ماتم کرنے یا لباس اور چہرے پر مٹی لگانے کے معنی میں ہے تو یہ مختلف مقامات اور مختلف زمانوں کے اعتبار سے مختلف ہے؛ مثلاً: ایک جگہ ماتم کرنا رائج ہے تو دوسری جگہ مصائب پڑھنا، تو کسی جگہ زنجیر لگانا وغیرہ۔ بنا بریں عزاداری کی بعض علامتیں عمومی اور ابدی ہیں جیسے آنسو بہانا اور مرثیہ پڑھنا اور بعض علامتیں مخصوص زمان ومکان سے مخصوص ہیں۔

منظور نظر ذات کی عزاداری میں مرثیہ پڑھنا اس کے اوصاف بیان کرنا، اس کے اخلاقی فضائل کا تذکرہ، اس کی مظلومیت کا بیان اور اس کے دشمن کی بے رحمی اور ظلم واستبداد کا تذکرہ عالمی ادبیات کی بہت ہی قدیم اور وسیع تاریخ ہے۔

دعبل خزاعی، کمیت، سید اسماعیل حمیری، ابونواس، سید رضی اور دوسری عظیم شخصیتوں کے اشعار نے تاریخ کی رہگذر میں حماسہ آفرینی کی ہے۔ اور لوگوں کو ظلم واستبداد کے خلاف شورش اور قیام کی دعوت دی ہے۔

ابا عبداللہ الحسینؑ کے لیے مرثیہ گوئی کے باب میں محتشم کاشانی کے اشعار اس قسم کی غزل گوئی اور مراثی کے میر کارواں ہیں۔

برصغیر میں عزاداری سید الشہدا کی تاریخ بہت وسیع اور قدیم تاریخ ہے جو ایک مفصل تحقیق کی نیاز مند ہے۔

کتاب حاضر نے ایران میں مرثیہ نگاری کی تاریخ پر نہایت تحقیقی مطالب پیش کیے ہیں، محقق محترم اس کتاب میں محتشم کاشانی سے نہایت متاثر دکھائی دیتے ہیں جو ان کی باریک بینی کی علامت ہے۔ایران میں عزاداری کا سابقہ بہت ہی طولانی اور قدیمی ہے بلکہ ایران میں عزاداری کا سابقہ، ایران میں تشیع کے ہمزاد ہے عزاداری کا سلسلہ یہاں ہمیشہ جاری اور ساری رہا۔گرچہ بعض زمانہ جیسے سلجوقیان یا پہلوی عہد میں عزاداری شیطانی طاقتوں کے ہاتھوں ممنوع قرار پائی لیکن اس کا وجود ہمیشہ رہا۔انقلاب اسلامی کے عہد میں عزاداری نے انقلاب کی تقویت اور پہلوی حکومت کے زوال میں بہت اہم کردار ادا کیا۔شیطانی طاقتوں کے خلاف سب سے عظیم احتجاجی جلوس محرم کے زمانہ میں ہی انجام پذیر ہوا۔

انقلاب کے کامیاب ہونے کے بعد ایران وعراق کی جنگ کے زمانہ میں بہت سارے افراد نے لوگوں کو جنگ میں بھیجنے کے لئے اور سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور ان میں جوش وولولہ پیدا کرنے کے لئے انہیں مرثیہ گوئی، حماسہ آفرین اشعار، زیارت کربلا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا ہی سہارا لیا۔

جرائت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ صدام کی فوج کے خلاف ایران کی فتح وظفر میں عزاداری اور زیارت کربلا کا شوق سب سے زیادہ اثر انداز رہا ہے۔

والسلام علیکم

احمد عابدی

۱۰/ مارچ ۲۰۱۵ء

تعارف:

ایران میں مرثیہ نگاری؛ ایک تاریخی جائزہ

پروفیسر شریف حسین قاسمی
(ریٹائرڈ پروفیسر امریٹس دہلی یونیورسٹی)

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے ایران میں مرثیہ نگاری؛ ایک تاریخی جائزہ کے عنوان سے ایک بنیادی اور تاریخی اہمیت کا علمی و تحقیقی کام انجام دیا تھا جو بدقسمتی سے ابھی تک شائع نہیں ہوسکا۔ راقم حروف کو اس کا مسودہ رضوی صاحب مرحوم کے صاحب زادے پروفیسر نیر مسعود نے ازراہ عنایت فراہم کیا ہے۔ راقم نیر مسعود صاحب کا ممنون ہے اور اسی کتاب کے تعارف کرانے کی حاضرین کرام سے اجازت چاہتا ہے۔

ایران میں مرثیہ نگاری ایک تاریخی جائزہ تقریبا ۲۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر ایران سے ایک کتاب مرثیہ سرائی در ادب فارسی، شائع ہوئی ہے حتی المقدور کوشش کے باوجود راقم اس کتاب کے مطالعے سے قاصر رہا۔ اس لئے اس پر اظہار رائے ناممکن ہے۔ بہر حال اتنا ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ کتاب ایران سے غالبا حال ہی میں شائع ہوئی ہے (۱) اور یہ بھی گمان طلب ہے کہ رضوی صاحب کی کتاب کے بعد ہی لکھی گئی ہوگی۔

---

(۱) مرثیہ سرائی در ادبیات فارسی (تا پایان قرن ہشتم) تالیف: نصر اللہ امامی، ناشر: انتشارات دفتر مرکزی جہاد دانشگاہی، تہران، ۱۳۶۹ھ۔

رضوی صاحب مرحوم کی تصنیف ایران میں مرثیہ نگاری ایک تاریخی جائزہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔اس موضوع پر ایران میں بہت کم لکھا گیا ہے اسی طرح وہ ایرانی علماء اور دانشور جنہوں نے فارسی زبان اور اس کے ادب پر بنیادی اور اہم کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں انہوں نے بھی مرثیہ نگاری پر کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی چونکہ ایران میں اور خود ہندوستان میں بھی فارسی زبان و ادب کا تعلق دربار سے نہات محکم اور تقریباً اٹوٹ تھا، اس لئے بیشتر دانشوروں نے فارسی ادب کی تاریخ کو ایران کی سیاسی تاریخ کے مطابق ہی تقسیم کیا ہے۔ایران کے مختلف شاہی خانوادوں اور ان کے حکمراں افراد سے وابستہ شعراء کی زندگی اور ان کے کلام سے بحث کی ہے۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی ''تاریخ ادبیات فارسی در ایران'' اپنے موضوع پر غالباً سب سے مفصل کتاب ہے، اس کی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں ۔ یہ کتاب درحقیقت فارسی ادب کا ایک دائرۃ المعارف ہے جس میں صفا صاحب نے حتی الامکان تمام معروف و غیر معروف، اہم اور غیر اہم شعرا اور دیگر نثر نگاروں کے احوال و آثار پر روشنی ڈالی ہے۔آپ نے اپنی ایک دوسری تصنیف میں فارسی نظم کے موضوعات بھی متعین کئے ہیں جیسے درباری شاعری، عارفانہ شاعری، داستان سرائی وغیرہ ،ڈاکٹر صاحب نے فارسی نظم کے موضوعات میں مرثیہ نگاری کو جداگانہ حیثیت نہیں دی بلکہ اسے مذہبی شاعری کے تحت رکھا ہے اور اس پر کوئی مبسوط گفتگو نہیں کی۔اسی طرح ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے ''تاریخ ادبیات ایران'' میں مرثیہ نگاری کے بارے میں محض چند سطریں محتشم کاشانی کے احوال و کلام پر تبصرے کے ضمن میں سپرد قلم کی ہیں۔ استاد ہمائی، استاد نفیسی وغیرہ نے بھی فارسی ادب کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان میں بھی مرثیہ نگاری پر علیحدہ سے کوئی بحث نہیں ملتی۔

مرثیہ نگاری اور اس کی تاریخ سے ایرانیوں کی بے اعتنائی کی وجہ کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے استاد امیر عباس حیدری نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''مرثیہ سرائی هیچ وقت در ایران جلوه نکرده است ، ایرانی خوش ذوق و نکته

سنج کہ گوش و دل او با نغمات بر وجد حافظ و خیام آشناست ، ذوق سلیمش مرثیہ پسند نمی تواند باشد ، در سراسر حیات ادبی ایران کم تر بہ اسم یك مرثیہ سرائی بزرگ بر می خوریم و سوای ترجیح بند محتشم کاشانی مرثیہ ای کہ چنگی بہ دل زند و حالی داشتہ باشد ، در دست نداریم''۔(۱)

(ایران میں مرثیہ گوئی کو کسی وقت بھی فروغ حاصل نہیں ہوا، خوش مذاق اور نکتہ سنج ایرانی جس کے کان اور دل حافظ اور خیام کے وجد آفرین نغموں سے آشنا ہیں اس کا ذوق سلیم مرثیہ پسند نہیں کر سکتا ایران کی پوری حیات ادبی میں کوئی بڑا مرثیہ گو ہم کو مشکل ہی سے ملے گا۔ محتشم کاشانی کے ترجیح بند کے سوا ہمارے پاس کوئی ایسا مرثیہ نہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہو اور وہ کسی خاص کیفیت کا حامل ہو)۔

استاد پورداؤد قدیم فارسی تاریخ، تمدن اور زبانوں کے معروف عالم تھے۔ انہیں ایران میں بڑا مقام حاصل ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے چند مرثیے بھی کہے، لیکن اپنے دیوان پوراندخت نامہ میں انہیں یہ کہہ کر شامل نہیں کیا کہ:

''چون اشعار رشت بیشتر در ماتم و سوگواری بود ، نہ خواستم کہ از قرأت آنہا درین دیوان دل کسی شکستہ شود و سیل اشك از دیدگان مردم جاری نمودہ واقعۂ طوفان نوح را تجدید کنم ، اگر در دنیا از چشمۂ چشم مردم اشك سرد و از تنور دلش آہ گرم بیرون کشیدن ہنری است ، ارزانی نوحہ خوانہا باد''۔(۲)

(جو اشعار ماتم اور سوگواری کے تھے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کو اس دیوان میں پڑھ کر کسی کا دل توڑا جائے اور آنسوؤں کا سیلاب جاری کر کے طوفان نوح کے واقعے کی تجدید کی جائے۔ اگر دنیا میں لوگوں کی آنکھوں سے ٹھنڈے آنسوؤں کا چشمہ جاری کرنا اور ان کے دل سے گرم آہیں

---

(۱) ماہنامہ، دانش، تہران، جنوری ۱۹۵۱ء۔

(۲) پوراندخت نامہ، مقدمہ

نکالنا کوئی ہنر ہے تو روضہ خوانوں کو مبارک ہو۔)

درج بالا بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایرانی فضلا نے مرثیہ نگاری پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اسی طرح کوئی اہم اور بنیادی کام انجام نہیں دیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر رضوی صاحب مرحوم کی ''ایران میں مرثیہ نگاری، ایک تاریخی جائزہ'' اپنے موضوع پر نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ رضوی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں تحقیق و تلاش کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایک ایسے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جس پر غالباً ان سے پہلے کسی نے مبسوط طریقے پر اظہار رائے نہیں کیا تھا۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے مصنف وسیع مطالعے کے شخص تھے وہ ایک مخصوص موضوع سے متعلق بنیادی اور لازمی مآخذ سے واقف تھے۔ اپنے موضوع سے متعلق کلیدی اطلاعات کی بنیاد پر صحیح اور مناسب نتائج اخذ کر سکتے تھے۔ اپنے نتائج سلیقے کے ساتھ تاریخی و ادبی پس منظر کے ساتھ پیش کر سکتے تھے وہ متنازعہ مسائل کو اس طرح پیش کرنے کی صلاحیت و استعداد کے حامل تھے کہ اپنی بات بھی کہہ دیں اور کسی کا دل بھی نہ دکھے۔ ایران میں مرثیہ نگاری میں بارہا ایسے مقامات آئے ہیں جہاں سنی شیعہ عقائد، نظریات اور راویوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان کے آپسی اختلافات پر گفتگو ہوئی ہے۔ لیکن رضوی صاحب مرحوم کے محتاط اور عالمانہ قلم نے نہایت احتیاط کے ساتھ انہیں اس طرح بیان کیا ہے کہ کسی کو بے جا اعتراض کا موقع نہ ملے اور ادبی بحث کسی مذہبی تنازعہ کا باعث نہ بن جائے۔

رضوی صاحب نے اپنی کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی ہے ہر باب میں مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ پہلا باب چوبیس (۲۴) عنوانات پر مشتمل ہے۔ ان میں چند عنوانات اس طرح ہیں:

عربوں سے ایرانیوں کی بیزاری اور اس کے اسباب، حضرت علی سے ایرانیوں کی محبت اور اس کے اسباب، امام حسین اور سید سجاد سے ایرانیوں کی عقیدت، مذہب شیعہ کی طرف ایرانیوں کا فطری میلان، عربوں کے برتاؤ کا ردعمل شعوبی تحریک، رودکی کے کلام میں مرثیت وغیرہ۔

مصنف نے اس باب میں تاریخی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی امیہ اور

عباسی خلفا کے دور میں عزاداری کا رواج ممکن تھا۔ ایران میں سب سے پہلا بادشاہ یعقوب بن لیث تھا جس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث تخت سلطنت پر بیٹھا یہ دونوں بادشاہ شیعہ تھے اور عباسی خلافت کے استیصال میں کوشاں رہے۔ یہ اطلاع دینے کے بعد رضوی صاحب اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''ایرانیوں کو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے امام حسینؑ اور ان کی اولاد سے دلی تعلق تھا اور واقعۂ کربلا کو وہ ایک قومی سانحہ سمجھتے تھے، عمرو بن لیث کے دور میں عزاداری کا رجحان یقینی طور پر موجود تھا، کچھ عجب نہیں کہ صفاریوں کے عہد میں عزاداری کا رواج ہو گیا ہو''۔

مصنف نے یہ ایک ایسا مفروضہ پیش کر دیا ہے جس کی تائید معتبر ماخذ سے ابھی ہونا باقی ہے۔ فارسی ادب کا طالب علم اس دل چسپ حقیقت سے واقف ہے کہ ہم اگر فارسی کی مختلف اصناف سخن سے بحث کرتے ہیں تو اس کا نقطہ آغاز کم از کم رودکی کو ضرور قرار دیتے ہیں۔ رودکی فارسی کا پہلا عظیم شاعر ہے۔ فارسی غزل کی بحث ہو یا فارسی مثنوی کی، ہم ان کے ابتدائی نقوش رودکی کے کلام میں تلاش کرتے ہیں۔ رضوی صاحب نے بھی اس روایت سے چشم پوشی نہیں کی آپ نے ''رودکی کے کلام میں مرثیت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

مشہور اسمٰعیل داعی ناصر خسرو اپنے ایک شعر میں رودکی کا ذکر اس طرح کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آل رسول کی مدح اس کی شاعری کا خاص موضوع تھا وہ شعر یہ ہے:

جان را ز بهرِ مدحت آل رسول
گه رودکی و گاهی حسان کنم

اس کے بعد آپ اظہار خیال کرتے ہیں کہ آل رسول کا کوئی مداح امام حسینؑ کی مدح سے گریز نہیں کر سکتا۔ اور امام حسینؑ کی مدح واقعۂ کربلا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر رودکی نے امام حسینؑ کا کوئی باقاعدہ مرثیہ نہ بھی کہا ہو، تو بھی اس کی ان نظموں میں جو امام حسینؑ کی مدح میں تھیں، مرثیت کا عنصر ضرور ہوگا۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جس کی تصدیق کے لئے فی الحال ہمارے پاس

ذرائع موجود نہیں۔ رودکی کا مکمل کلام ہم تک پہنچا نہیں پھر بھی اس کے تقریباً ایک ہزار شعر آج دستیاب ہیں۔ ان میں ایسے اشعار یا نظموں کا وجود نہیں۔ جو مرثیہ کہلائیں یا جن میں مرثیت نظر آئے۔

اسی پہلے باب میں ایک جگہ رضوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''عربوں نے ایران کے بے بہا صنعتی شاہ کار، بیش قیمت جواہرات اور انمول خزانے ہی تباہ نہیں کئے بلکہ علمی اور ادبی ذخیرے اور کتب خانے بھی تلف کر دیئے''۔

یہ ایک عام عقیدہ ہے۔ متعدد کتابوں میں اس کا اظہار ہوا ہے۔ ایران میں مسلمانوں کے ہاتھوں کتب سوزی کا افسانہ ابن خلدون (۱۳۳۲۔۱۴۰۶) کے ہاں اس کے مقدمے میں ملتا ہے۔(۱) چند سال قبل جناب مرتضی مطہری نے اس بے بنیاد عقیدے کی مدلل نفی کی ہے اور اس موضوع پر ''کتاب سوزی ایران ومصر'' (۲) ترتیب دی ہے۔ مطہری صاحب کا نام ان لوگوں کے لئے نیا نہیں جو ایران کے حالیہ اسلامی انقلاب کے فکری عوامل اور اس کی سیاسی پیش رفت کا مطالعہ رکھتے ہیں۔

رضوی صاحب کی مورد بحث کتاب کا دوسرا باب بارہ عنوانات پر مشتمل ہے اس باب میں آپ نے سلجوقی دور، تاتاری دور اور تیموری عہد میں عزاداری اور مرثیہ نگاری پر اظہار رائے کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ رضوی صاحب سلجوقی دور سے پہلے غزنوی دور میں کسی مرثیہ نگار کا پتا نہیں چلا سکے اور اسی طرح اس شاندار ادبی دور میں عزاداری کا ثبوت بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ مصنف کے بقول ممکن ہے کہ سلجوقی بادشاہ عزاداری کے مخالف ہوں اور خود عزاداری نہ کرتے ہوں، لیکن ایسے قرینے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقی سلطنت کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی امام حسینؑ کی عزاداری بالاعلان ہوتی تھی۔

سلجوقی دور میں مرثیے کہے گئے یا نہیں اس کا علم نہیں، لیکن واعظ کاشفی نے روضۃ الشہداء میں اس دور میں ایک فارسی مقتل کی تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ مقتل ابوالمفاخر خوارزمی یا ابوالمفاخر رازی نے

(۱) ابن خلدون، مقدمہ ۲، ۱۰۱۔

(۲) اس کا اردو ترجمہ ''ایران ومصر میں کتب سوزی'' (مسلمانوں پر عائد ایک تاریخی الزام کا تجزیہ) کے نام سے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے۔

لکھا تھا۔ یہ مقتل فارسی نثر میں تھا مگر اس میں جا بجا فارسی نظمیں اور عربی نظموں کے منظوم فارسی ترجمے بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور فارسی مقتل مصنفہ نور الائمہ خوارزمی کا ذکر بھی رضوی صاحب نے روضۃ الشہدا کے حوالے سے کیا ہے۔ ان مقتلوں کا ذکر کرنے کے بعد رضوی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں جو منطقی طور پر صحیح نظر آتا ہے کہ:

عربی میں مقتل کی کئی کتابیں موجود تھیں اور ان میں رجزوں اور مرثیوں کے اصل عربی اشعار بھی موجود تھے۔ اس عہد کے تمام پڑھے لکھے لوگ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ان حالات میں فارسی مقتلوں کا لکھا جانا اور ان میں عربی نظموں کا فارسی ترجمہ شامل کیا جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ کتابیں عوام کے لئے لکھی گئی تھیں اور اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں ایران میں عزاداری کا عام رواج تھا۔

اسی باب میں رضوی صاحب نے حکیم سنائی، غزنوی کی حدیقۃ الحقیقۃ معروف بہ حدیقۂ سنائی سے مرثیے کے اشعار اور اسی طرح خواجہ عطار نیشاپوری کی ایک مثنوی خسرو نامہ میں ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جن میں مرثیت کا عنصر موجود ہے۔

خواجہ عطار کے آثار کے ضمن میں ایک اہم بات قابل توجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عطار کی اصلی اور مستند تالیفات کی ایک صحیح فہرست مرتب کرنا مشکل ہے۔ اس سے منسوب کتابوں کا انداز اس قدر مختلف اور متنوع ہے کہ ان سب کو ایک ہی شاعر کی تخلیق نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان میں منطق الطیر، الہی نامہ، مصیبت نامہ اور اسرار نامے کا اسلوب ایک جیسا ہے۔ ان کا شاعر بلاشبہ عطار ہے۔ خسرو نامہ اور پند نامے کو بھی کسی حد تک اسی شاعر سے نسبت دی جاسکتی ہے ہر چند ان کے اسلوب میں فرق ہے اسی طرح دیگر تصانیف کا عطار سے انتساب محل نظر ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی کے حوالے سے رضوی صاحب نے ایلخانیوں کے عہد حکومت میں بھی ایک صوفی شاعر اوحدی مراغہ ای کا ذکر کیا ہے جو ہر سال محرم میں شہدائے کربلا کی تعزیت میں چند شعر کہا کرتا تھا۔

ایلخانی دور کے بعد تیموری عہد میں محمد حسن سلیمی ایک قادر الکلام شاعر گزرا ہے۔ حضرت علیؑ اور

ائمہ معصومین علیہم السلام کی مدح میں اس نے اچھے اچھے قصیدے کہے ہیں۔ اسی دور کا ایک دوسرا مرثیہ گو آذری اسفرائینی ہے۔ رضوی صاحب کے بقول: پہلا طولانی اور بلند پایہ فارسی مرثیہ، جس کو ایران میں مدتوں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی، وہ سلیمی سبزواری کے ہم عصر شیخ آذری اسفرائینی کا کہا ہوا ہے۔ یہ وہی آذری ہے جو بعد میں سلطان احمد شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ ہوا۔ رضوی صاحب نے اس شاعر کے احوال و آثار پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس کا ایک مرثیہ بھی مکمل نقل کیا ہے۔

رضوی صاحب نے اپنی اس کتاب کے تیسرے باب میں اکتیس عنوانات قائم کیے ہیں۔ اس باب میں آپ نے بیشتر آذری، ابن حسام اور روضۃ الشہدا سے بحث کی ہے۔

آل تیمور کا آخری بادشاہ ابوالغازی سلطان حسین میرزا ابن منصور ہے۔ اس کے عہد میں ملا کمال الدین واعظ کاشفی نے مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے روضۃ الشہدا لکھی۔ روضۃ الشہدا کی اہمیت کے پیش نظر رضوی صاحب نے اس کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

روضۃ الشہدا ایک مدت تک مجالس عزا کی زینت رہی۔ اس کو پڑھنے کے لیے مخصوص پر اثر طرز ایجاد کیے گئے۔ بعض لوگوں نے اس کو پڑھنے کی خاص مہارت پیدا کر لی اور اس کا پڑھنا اپنا پیشہ بنا لیا۔ یہ لوگ روضہ خوان کہلائے۔

رضوی صاحب ایک جگہ ''حسین واعظ کا مذہب'' کے عنوان سے رقم طراز ہیں کہ:

''روضۃ الشہدا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا حسین واعظ مذہب اہل سنت تھے مگر حضرت علیؑ سے اتنی عقیدت اور اہل بیت سے اتنی محبت رکھتے تھے، عزاداری کے اتنے طرفدار تھے اور اس کی تبلیغ میں اس قدر کوشاں تھے کہ ان پر شیعہ ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے''۔

اس ضمن میں آپ یہ اہم اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ:

''روضۃ الشہدا میں لفظ شیعہ دوست، طرفدار، مددگار کے معنوی میں آیا ہے۔ اور اسی وجہ سے بالعموم اضافی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسے: با چندین از اقربا و شیعہ خویش، یا در آن محلہ شیعہ اہل

بیت بسیار بودند یا قبیلہ ہمدان تمام شیعہ پدر تو اند۔ اس لفظ کا اطلاق ایک فرد پر نہیں بلکہ جماعت پر کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہمیشہ جمع فعل لایا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ معنیٔ اہل سنت کا مقابل نہیں بلکہ دشمن، مخالف یا بدخواہ جماعت کا۔ اس معنی میں مصنف روضۃ الشہدا کا شمار شیعہ اہل بیت میں کیا جا سکتا ہے"۔

یہ عبارت مصنف کے نہایت عالمانہ، محققانہ اور منصفانہ رویے کی ترجمان ہے۔ آپ نے افراط وتفریط میں گرفتار دیگر محققین و مصنفین کی طرح حسین واعظ کاشفی کو شیعہ نہیں لکھا ہے۔

رضوی صاحب مرحوم کی مورد بحث کتاب کا چوتھا باب عہد صفوی میں مرثیہ نگاری سے متعلق ہے در حقیقت یہ کتاب کا سب سے مفصل باب ہے۔ صفوی عہد ہی میں مرثیہ نگاری کو ایران میں سب سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور یہ صنف سخن اپنی معراج کو پہنچی۔

رضوی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ: صفوی بادشاہوں نے اپنے مذہبی عقائد اور سیاسی مصالح کی بنا پر آل رسول سے عقیدت اور ان کے مخالفوں سے نفرت کے جذبات کو ابھارنے اور ترقی دینے کے لئے ہر طرح کی تدبیریں اختیار کیں۔

رضوی صاحب نے اس کے بعد تاریخ عالم آرائے عباسی سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو عہد صفوی میں فارسی شاعری کی تاریخ میں بالعموم اور مدح ائمہ اور مراثی شہدائے کربلا کی تاریخ میں بالخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ اس اقتباس کا خلاصہ اردو میں پیش خدمت ہے:

"اوائل حال میں حضرت خاقانی جنت مکانی (شاہ طہماسپ) طبعہ شعرا پر پوری توجہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں مرزا شرف جہان اور مولانا حیرتی آپ کے ہم صحبت اور معاشر مجلس تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں چوں کہ آپ نے امر بہ معروف و نہی از منکر میں مبالغے سے کام لینا شروع کر دیا اور طبعہ شعرا کو وسیع مشرب سمجھنے کی وجہ سے انہیں صلحا و اتقیا میں شامل نہیں کیا، اس لیے ان کی طرف توجہ دینی بھی ختم کر دی۔ انھیں قطعہ یا قصیدہ پیش کرنے کی اجازت عطا نہیں کی جاتی تھی۔ مولانا محتشم کاشی نے ایک قصیدہ شہزادے اور بادشاہ کی مدح میں کاشان سے ارسال کیا جسے شہزادے نے بادشاہ کی خدمت میں

پیش کرنا چاہا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اس بات پر آمادہ نہیں کہ شعرا میری مدح و ثنا میں زبان کھولیں۔ انھیں حضرت شاہ ولایت پناہ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں قصائد کہنے چاہیے۔ وہ پہلے ان حضرات کی ارواح مقدسہ سے طالب صلہ ہوں اور اس کے بعد ہم سے نوازش و الطاف کی امید کریں جب یہ اطلاع مولانا محتشم کاشی کو ملی تو اس نے حضرت شاہ ولایت کی شان میں مولانا حسن کاشی کے ہفت بند کی پیروی میں ایک منظومہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور مناسب صلہ پایا۔ دار الحکومت میں موجود شعرا نے بھی ان کی پیروی کی اور پچاس ساٹھ ہفت بند بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئے اور سب کو صلہ سے نوازا گیا''۔

فارسی مرثیہ نگاری میں صفوی دور کے محتشم کاشی کا نام سب سے اہم اور معروف ہے اس نے اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ رضوی صاحب کے الفاظ ہیں:

قصیدوں میں تخیل کے زور دکھائے، مبالغے کے طوفان اٹھائے، غزلوں میں عشق کی سچی داستانیں سنائیں، محبت کی جھوٹی کہانیاں بنائیں، مختصر یہ کہ ساری عمر مدحت طرازی اور غزل سرائی میں صرف کردی۔ اتفاق سے واقعۂ کربلا کے متعلق ایک چھوٹا سا مرثیہ بھی کہہ دیا۔ محتشم کو کیا خبر تھی کہ ان کی عظمت و شہرت کی وسیع و وقیع عمارت اسی مختصر بنیاد پر قائم ہوگی''۔

محتشم کا مشہور عالم مرثیہ ایک ترکیب بند نظم ہے جس میں آٹھ آٹھ شعروں کے بارہ بند ہیں اور اسی وجہ سے وہ عام طور پر دوازدہ بند کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔

کاشی کے اس بند کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دوازدہ بند مکمل یا اس کے اقتباسات ایران میں مختلف مذہبی عمارتوں جیسے روضوں اور دیگر بزرگان دین کے مقابر پر کندہ ہیں۔ رضوی صاحب نے ۱۹۳۳ء میں ایران و عراق کی سیاحت کے دوران وہاں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کے وقت اس حقیقت کا خود مشاہدہ کیا تھا۔

رضوی صاحب نے ایسے چند شعرا کے حوالے بھی قلم بند کیے ہیں جنھوں نے ایران و ہندوستان میں محتشم کے اس لافانی مرثیے کے جواب میں مرثیے کہے ہیں۔ ان میں چند شعرا کے نام یہ ہیں:

نصیبی کرمانشاہی، حبیب کردستانی، جودی خراسانی، خاکی شیرازی، وصال شیرازی، وقار شیرازی وغیرہ۔ محتشم کاشانی کا جب بھی ذکر کیا جائے گا تو ایران کے ایک دوسرے نسبتاً غیر معروف شاعر کا ذکر لازمی ہے اور وہ ہے ملا حسن کاشی۔ ملا حسن کاشی، محتشم کاشانی سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے تاتاری بادشاہ سلطان محمد خدابندہ (اولجائتو خربندہ) کے زمانے میں گزرا ہے۔ حسن کاشی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ محمد و آل محمد کی مدح میں بسر کیا۔ ملا حسن کاشی کا ایک ہفت بند حضرت علیؑ کی مدح میں ہے جس کے بارے میں قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اظہار رائے کیا ہے کہ:

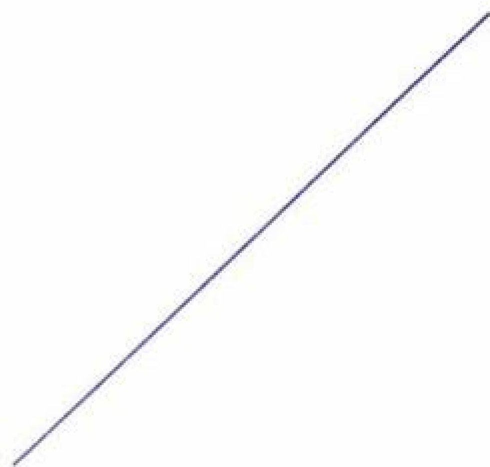
''از جمله قصائد بی مانند او قصیده ایست هفت بند که اکثر استادان متاخرین در تبع آن در سفته اند و به لطافت تا غنایت چیزی نگفته اند''۔

راقم الحروف عرض کر چکا ہے کہ رضوی صاحب مرحوم بنیادی طور پر محقق تھے۔ وہ اپنے مآخذ کا توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ ان پر ایک تحقیقی نظر ڈالتے تھے۔ اگر ان کے مآخذ میں کوئی تاریخی اشتباہ یا غلط فہمی یا ابہام انھیں نظر آتا تو وہ اس سے درگزر نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح صورت حال بیان کرنا لازمی سمجھتے تھے۔ بعض مصنف کو محتشم کے ہفت بند اور مرثیے میں التباس واقع ہوا۔ اسی طرح بعض اہل قلم حسن کاشی کے مشہور ہفت بند کو محتشم کاشی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔

آزاد بلگرامی نے اپنے مشہور تذکرے ''خزانۂ عامرہ'' میں محتشم کا حال بیان کیا۔ آزاد بلگرامی بھی حسن کاشی اور محتشم کاشی کے قصائد و مراثی کے سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ رضوی صاحب نے اس ضمن میں وضاحت کی ہے کہ:

علامہ آزاد نے اپنے مشہور تذکرہ شعرا ''خزانۂ عامہ'' میں محتشم کا حال لکھتے ہوئے تاریخ عالم آرائے عباسی کا حوالہ دے کر اس بیان کا خلاصہ دیا ہے (اس بیان کا ملخص اردو ترجمہ اس مضمون میں دیا جا چکا ہے) یہ خلاصہ بالکل صحیح ہے لیکن علامہ نے بعد میں لکھا ہے کہ: ''ترکیب بند مرثیه سید الشهدا رضی الله عنه گفته فرستاد و بجائزه لایقه کامیاب گردید'' یعنی محتشم نے امام حسین کا ترکیب

باب اول



ایران میں مرثیہ گوئی کی ابتدا

نوحہ و ماتم اور جذبات غم و الم کو نظم سے جو فطری مناسبت ہے، اس کی بنا پر یہ امر قرین قیاس ہے کہ ایران میں مرثیہ گوئی کی بنیاد دیلمیوں کے زمانے میں پڑی ہوگی ۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی علمی اور ادبی زبان عربی تھی ۔ خود ایرانی بھی اپنی نظم و نثر تصنیفوں میں زیادہ تر عربی زبان استعمال کرتے تھے مگر فارسی کہنے والے شاعر اس وقت بھی موجود تھے ۔ تذکرہ لباب الالباب کے مصنف محمد عوفی کے بیان کے مطابق جنیدی، منطقی رازی اور خسروی، سرخسی دیلمیوں کے ذی علم وزیر صاحب اسماعیل بن عبّاد (۱) سے وابستہ تھے ۔ اسماعیل خود عربی زبان کا شاعر تھا ۔ اس نے امام حسین علیہ السلام کا مرثیہ بھی کہا ہے "مجمع الفصحا" کے مصنف رضا قلی خان ہدایت نے لکھا ہے کہ منطقی رازی بندار رازی، غضائری رازی، قمری مازندرانی اور عمادی شہریاری سلاطین دیلمی کے مداح تھے ۔ ان کے علاوہ بہت سے فارسی گو شعرا اور بھی تھے ۔

---

(۱) صاحب اسماعیل بن عبّاد ۳۲۵ھ/۹۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں وفات پائی ۔ وہ دو دیلمی بادشاہوں یعنی موید الدولہ (متوفی ۳۷۳ھ/۹۸۳ء) اور فخر الدولہ (متوفی ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کا وزیر رہا، زبردست عالم اور علم و ادب کا مربی تھا ۔ اس کی فیاضیوں کی کشش سے شاعروں اور ادیبوں کا ایک مجمع اس کے گرد رہتا تھا ۔ کئی کتابیں اس کی تصنیف سے تھیں ۔ عربی میں شعر بھی کہتا تھا ۔ کتابوں کا عاشق اور ایک بہت بڑے کتب خانے کا مالک تھا ۔ سامانی بادشاہ نوح بن منصور نے اس کو اپنا وزیر بنانا چاہا تو اس نے ایک عذر یہ بھی پیش کیا کہ صرف میری کتابیں لے جانے کے لیے چار سو اونٹ درکار ہوں گے ۔

ایرانی شاعروں کے لیے مرثیہ گوئی کے کئی زبردست محرک موجود تھے، یعنی امام حسینؑ سے محبت، اپنے مربی کی خوشنودی اور بادشاہ وقت کا رجحان۔ قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے مرثیے ضرور کہے ہوں گے۔ مگر ان کے اور کلام کی طرح ان کے مرثیے بھی ہم تک نہیں پہنچے۔

سلجوقی عہد میں عزاداری:

مولانا کمال الدین حسین واعظ کاشفی نے روضۃ الشہدا میں ابوالمفاخر کے مقتل کا ذکر یوں کیا ہے: ''ابو المفاخر خوارزمی (۱) در مقتلی که نوشته ...'' (۲) یہ ابوالمفاخر کون تھا اور کس زمانے میں تھا؟ دولت شاہ اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتا ہے کہ استاذ الشعرا ابوالمفاخر رازی سلطان غیاث الدین محمد بن ملک شاہ (۴۸۵ تا ۴۹۸ھ/ ۱۱۰۵ تا ۱۱۱۷ یا ۱۱۱۸ھ) کے زمانے میں تھا۔ وہ ایک کامل دانشمند، فاضل شاعر اور مختلف علوم کا ماہر تھا۔ اس کا استادوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی شاعری میں طرح طرح کی خوبیاں ہیں۔ اس کے اشعار زیادہ تر لغز کے طرز کے ہیں اور یہ اس کی مسلمہ صفت ہے۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا کی منقبت میں اس کے کئی قصیدے ہیں، سب کے سب مرصع اور متین، لیکن ایک قصیدہ کی بہت شہرت ہے اور اکثر شاعروں نے اس کا جواب کہنے کی کوشش کی ہے اس کا مطلع یہ ہے:

بال مرصیع بسوخت مرغ ملمع بدن		اشك زليخا بريخت يوسف گل پيرهن

بڑے بڑے شاعروں نے بہت سے مطلع اس مضمون کے کہے ہیں لیکن غالبا طلوع آفتاب کا بیان اس انداز سے کسی نے نہ کیا ہوگا۔

شیخ ابوالمفاخر کو سلاطین اور حکام میں بہت عزت اور مقبولیت حاصل تھی۔ تاریخ سلجوقی (۳) کا

---

(۱) روضۃ الشہدا ص ۲۶۰ میں ابوالمفاخر کو رازی لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔

(۲) روضۃ الشہدا ص ۱۹۶۔

(۳) امین احمد رازی اس تاریخ کو ابوطاہر الخاتونی کی تصنیف بتاتا ہے (ہفت اقلیم)۔

مصنف کہتا ہے کہ محمد بن ملک شاہ کے بعد اس کے فرزند سلطان مسعود نے کوئی چودہ برس عراق پر حکومت کی۔ایک مرتبہ مازندران جاتے ہوے وہ ولایت رے میں ٹھہرا۔اس کے لشکریوں نے اہل رے کے کھیتوں میں اپنے جانور چھوڑ دیے اور بے عنوانیاں کرنے لگے۔یہ دیکھ کر ابوالمفاخر نے ایک قطعہ کہہ کر سلطان کو بھیجا اور سلطان نے لشکر والوں کو سخت تنبیہ کی۔وہ قطعہ یہ ہے:

ای خسروی که سا بس حکم تو بر فلك — بر تر ز طاق طارم کیوان نشسته است

لطفت به آستین کرم پاك می کند — گردی که بر صحیفه دوران نشسته است

بر تخت ری تو ساکن و از حکم نافذت — در ملك چین به مرتبه خاقان نشسته است

شاها سپاه تو که چو مور اند و چون ملخ — بر گرد دخل و دانه دهقان نشسته است

باران عدل بار که این خاك سالهاست — تا بر امید وعده باران نشسته است

سلطان غیاث الدین ابوالفتح محمد بن ملک شاہ دین دار بادشاہ تھا اس نے بارہ برس سلطنت کر کے ۴۹۸ھ (۱۸-۱۱۱۷ء) میں انتقال کیا۔(۱)

امین احمد رازی اپنی کتاب ہفت اقلیم میں لکھتا ہے کہ ابوالمفاخر نامور شعرا میں تھا۔اس کا ایک قصیدہ حضرت علی بن موسی الرضاؑ کی مدح میں اتنا پر صنعت اور دقیق ہے کہ ہر شخص کا فہم و ادراک اس کے معنی کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔وہ اس قدر مغلق ہو گیا ہے کہ اس میں مزہ نہیں رہا۔

مجالس المومنین میں ابوالمفاخر کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تذکرہ دولت شاہ سے لیا گیا ہے، مگر اس کے جس قصیدے کا صرف مطلع دولت شاہ نے نقل کیا ہے اس کے ۳۵ شعر اور نقل کر دیئے گئے ہیں۔ان میں ایک شعر یہ ہے:

مهر به خونناب گرم غرق شله چون حسینؑ — صبح به الماس مهر خسته شله چون حسنؑ

اس قصیدے کی تشبیب کے اشعار بہت مشکل ہیں ان کا سمجھنا گویا معمے حل کرنا ہے۔مدح کے

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ، ص ۳۸، ۳۹۔

اشعار نسبۃً آسان ہیں۔ ابوالمفاخر کو خود بھی احساس تھا کہ ان شعروں کو سمجھنا مشکل ہے۔ چنانچہ وہ مقطع میں کہتا ہے:

گفت مفاخرؔ بخوان معنی بیتش بدان — تا که چه گفته است او ز اول و آخر سخن

ملا حسین واعظ کاشفی نے روضۃ الشہدا میں کئی جگہ ابوالمفاخر کے مقتل کے حوالے دیئے ہیں (۱) یہ مقتل فارسی نثر میں تھا، مگر اس میں جا بہ جا فارسی نظمیں اور عربی نظم کے فارسی منظوم ترجمے بھی شامل تھے۔ ان میں سے کئی نظموں کے کچھ کچھ شعر روضۃ الشہدا میں درج کیے گئے ہیں جو یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

عمر ابن سعد کے اشعار:

مرا بخواند عبید الله از میان عرب — رسید بر دلم از خواندنش هزار تعب
مرا امارت ری داد و گفت حرب حسین — قبول کن که از او ملك راست شو ر و شغب
به ملك ری دل من مائل است و میترسم — به کینه چون بکشم پادشاه ملك عرب
چگونه تیغ کشم در رخ کسی کو راست — شجاعت و نسب و علم و حلم و فضل و ادب
سزای قاتل او دوزخ است و میدانم — که این چنین عمل آرد خدای را به غضب
ولی چو من نگرم در ری و حکومت آن — همیرود ز دلم خوف نار ذات لهب (۲)

حر کا رجز:

منم شیر دل حُر مردم رُبای — کمر بسته پیش ولی خدای
منم شیر و شمشیر بُرّان به دست — که دارد بر شیر و شمشیر پای (۳)

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۳۵، ۳۴۵، ۳۶۲، ۳۷۳، ۳۷۶۔

(۲) روضہ، ص ۲۵۳۔

(۳) روضہ، ص ۲۶۷

بریر ہمدانی کا رجز:

چون بُریرم یلی و پُر هُنرم منم آنکس که عمروی سمرم
بنده آلم و برخار جیان نیك میدان که زهر بد بترم
دلت در دامن آنها زده ام پرده بر دشمن آنها بدرم(۱)

عمرابن خالد کا رجز:

ای نفس عزیز ترك جان کُن ترتیب بهشت جاودان کُن
از بهرِ شهود عرض اکبر خود را بشهادت امتحان کُن
و ز شعله تیغ آسمان رنگ اطرافِ زمین چو ارغوان کُن
در معرکه همچو شیر مردان سر پیشکش خدا یگان کُن(۲)

حبیب ابن مظاہر کا رجز:

حبیب مظاهر منم مرد مرد بر انگیزم از آتش و آب گرد
سری دارم از دوستان پُر وفا دلی دارم از دشمنان پُر نبرد(۳)

ابوذر غفاری کے آزاد کردہ غلام حبشی حُرہ یا حُریر کا رجز:

چون من سوی میدان شجاعت بخرامم بس خصم که بی جان شود از ضرب حسامم
بگزیده مردانم اگرچه ز سیاهم بستوده شاهانم اگرچه ز غلامم
فردا بود آسان به شفاعت همه کارم امروز بر آید به شهادت همه کامم(٤)

---

(۱) روضہ، ص ۲۸۶

(۲) روضہ، ص ۲۸۰

(۳) روضہ، ص ۲۹۰

(۴) روضہ، ص ۲۹۱

امام زین العابدینؑ کے ترک غلام کا رجز:

ای حسین ای گهر روحانی — نسخه مکرمت سبحانی

منم آن ترك که سلطان باشم — گر تو ام هندوی حضرت خوانی

تیغ بر دست من از معجز تو — بر سر خصم کند ثوبانی

چو شود گر تو بروی خوش خویش — سرخ روی ابدم گردانی

رو بروی من غمگینی نه — چون کنم ترك سرای فانی(۱)

جعفر ابن عقیل کا رجز:

قرة العین عقیلم من و مولای حسینؑ — دل و جان پاك ز آلایش هر تهمت و شین

پسر عم من است این شه و شهزاده که هست — قرة العین نبی چشم و چراغ ثقلین

این حسین ابن علی هست که جبریل امین — پرورش داده ورا در ظلل اجنحتین(۲)

عون ابن عبداللہ کا رجز:

مائیم به قوت عیانها — برخاسته از ره گمانها

در معرض رغبت شهادت — بردست نهاده نقد جانها

چون اختر تیغ زن کشیده — در دیده اهرمن سنانها

ای قبله طراز دین تازی — ما طائفه نیستیم از آنها

کز خدمت او ملول گردیم — در زیر و زبر شود جهانها

یا بفروشیم حاش لله — وصل تو به اصل خان و مانها(۳)

---

(۱) روضہ، ص ۲۹۹

(۲) روضہ، ص ۲۹۳

(۳) روضہ، ص ۳۰۰۔

عبداللہ بن حسن کا رجز:

خواجه هر دو جهان جد من است — جد دیگر ولی ذو المنن است
پدر محترم محتشمم — نور بینائی زهراؑ حسنؑ است
وین شهنشاه گرانمایه حسینؑ — هادی راه حق و عم من است
نائب ذو المنن است اندر دین — آن که امروز امام زمن است
تو چه مرغی ترا خارجیان — روش و پرورش اندر چه فن است
طائر قدسم و عم پدرم — شاه طیار و مرصع بدن است
حاصل عمر شما اهل نفاق — طاعت و پیروی اهرمن است
زود رفتن به سفر کار شما است — جان ربودن زبدن کارمن است (۱)

قاسم بن حسن کا رجز:

دل خریدار جاه خواهم کرد — جان شکر ریز شاه خواهم کرد
با اساس و لباس دامادی — عزم و ترتیب راه خواهم کرد
به سُم مَرکب و سرِ نیزه — ماه و ماهی تباه خواهم کرد
آب هندی و باد تازی را — به شهادت گواه خواهم کرد
بلبل آئین به نغمهای حزین — بانك وا سیّداه خواهم کرد
کبریا را وکیل خواهم ساخت — مصطفی را گواه خواهم کرد
با بتولؑ و علیؑ شکایتِ قوم — در حریم اله خواهم کرد(۲)

---

(۱) روضہ، ص ۳۰۱

(۲) روضہ، ص ۳۰۷

ابوبکر ابن علی کا رجز:

شاہ و برادر من است اختر آسمان دین مهتر و بهتر زمان قبله و قدوه زمین
لالهٔ روضهٔ صفا، گلبن باغ آصفی چشم و چراغ مصطفی، میر و امام راستین
گوهر کان اجتبی، مهر سپهر اهتدی طره نشان طاوها چهره کشای یا و سین
من نه برادر وَیَم خادم و چاکرِ وَیَم پیش دو دیدهٔ شما خارجهان تیره دین
تحفهٔ جان و دل به کف آمده ام بدر گهش دیده و رخ بر آستان تیغ و کفن در آستین(۱)

علی اکبر کا رجز:

ساقی کوثر آب می خواهد میر مجلس شراب می خواهد
گیسوان سیه سفید حسینؑ کیست کز خون خضاب می خواهد
کیست آن کوز فرط بی نمکی دل زهراؑ کباب می خواهد
پنجهٔ شیر در طریق خطر راه آب از کلاب می خواهد
مومنان در بهشت و منکر ما سوی دوزخ شتاب می خواهد(۲)

امام کی زبان سے حُر کا مرثیہ:

خوشا حر فرزانه نامدار که جان کرده بر آل احمدؐ نثار
ز رخش تکبر فرود آمده شده بر بُراق شهادت سوار
به عشق جگر گوشهٔ مصطفیؐ بر آورده از جان دشمن دمار(۳)

---

(۱) روضہ، ص ۳۱۳
(۲) روضہ، ص ۳۲۱
(۳) روضہ، ص ۲۶۹

ایک اور قدیم فارسی مقتل مصنفہ نور الائمہ خوارزمی:

ملا حسین واعظ کاشفی روضۃ الشہدا میں لکھتے ہیں:

۱۔ دَر مقتل نور الائمه آورده اند ۔(۱)

۲۔نور الائمه خوارزمی در مقتل خود آورده که مسلم ازبام قصر فرو نگریست ، مردم بسیار دید از اهل کوفه ، ایستاده بودند و نظاره وی می کردند ، روی بدیشان کرد و بیتی چند عربی ادا فرمود که ترجمه آن اینست:(۲)

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نور الائمہ خوارزمی نے بھی ایک مقتل لکھا تھا جو فارسی زبان میں تھا اور اسی لیے اس نے عربی نظموں کا فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ نور الائمہ کا حال کسی تذکرہ یا تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا۔

روضۃ الشہدا میں نور الائمہ کے مقتل سے روایتیں لی گئیں ہیں (۳) اور اس کی نظمیں جا بہ جا نقل کی گئی ہیں۔ یہ نظمیں بیشتر عربی نظموں کے فارسی ترجمے ہیں۔ کچھ نظمیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

مسلم ابن عقیل کا اہل کوفہ سے خطاب:

ای کوفیان چو سر ز تن من جدا کنید　　باری تن مرا به سوی خاکدان برید

هر کاروان که جانب مکه روان شود　　پیراهن مرا به سوی کاروان برید

گوئید کز برای خدا بهر یادگار　　نزد حسینؑ جامهٔ پُر خون نشان برید

رحمی بر آب چشم یتیمان من کنید　　آن دم که یاد کشتن من بر زبان برید

چون طفل کان من خبر ما طلب کنند　　از من تحیتی سوی آن طفل کان برید(۴)

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۸۸　　(۲) روضۃ الشہدا، ص ۲۲۲

(۳) روضۃ الشہدا، ص ۲۵۰، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۸۰، ۲۸۳، ۳۲۸، ۳۳۸، ۳۳۹۔

(۴) روضۃ، ص ۲۲۲

عبدالرحمن ابن عروہ غفاری کا رجز:

چون من اندر عرب جوان نہ بود | در عرب چہ کہ در جهان نہ بود
چو بہ دستان حرب آرم روی | رستم زال را امان نہ بود
جان فدای حسینؑ خواهم کرد | کہ جز او را حت روان نہ بود(۱)

عبداللہ بن جعفر کا رجز:

با شما کار زار خواهم کرد | بر شما کار زار خواهم کرد
و ز برای دل حسینؑ علیؑ | جان خود را نثار خواهم کرد
تا کنم دست ظالمان کوتاه | پا بہ حرب استوار خواهم کرد
کین خود از شما بخواهم خواست | سرّ دل آشکار خواهم کرد
شکوه درپیش جعفر طیار | از شمابی شمار خواهم کرد(۲)

علی اکبر کا پہلا رجز:

منم علی حسین علیؑ کہ خسرو مهر | فراز تخت فلك كمترين غلام من است
من از نژاد شهی ام کہ قدر او می گفت | کہ خطبہ شرف سرمدی بنام من است
عنان ز معرکہ خصم بر نخواهم تافت | چرا کہ تو سن تند سپهر رام من است(۳)

امام حسینؑ کی اہل حرم سے رخصت:

اینك آمد نوبت من الوداع | الوداع ای عترت من الوداع

(۱) روضہ، ص ۲۸۵

(۲) روضہ، ص ۲۹۹، ۳۰۰

(۳) روضہ، ص ۳۲۱

دم بــدم خـواهیـد چـون ابـر بهـار　　　گـریــه کـرد از حسـرت مـن الـوداع

زود دلــهـــای شما خواهد شدن　　　ســوز نـاك از فـرقـت من الوداع(۱)

ایک جگہ امام حسین کے رجز کا فارسی منظوم ترجمہ لکھا گیا ہے مگر مترجم کا نام نہیں لیا گیا ہے ممکن ہے کہ خود مصنف روضۃ الشہدا نے ترجمہ کیا ہو رجز کے وہ اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

جَدِّ ما خیر الوریٰ فاضل ترین انبیا ست　　　آفتـاب اوج عـزت شمع جمع اصفیاست

منقبت های پدر گر بر شمارم دور نیست　　　دُرِّ دُرج لا فتیٰ و بدر بُرج هل اتیٰ ست

مـادرم خیـر الـنسا فرزند خاص مصطفیؐ　　　بـر کـمـال او کلام بضعة منّی گواست

و ز برادر گر پرسی هست شاه دین حسنؑ　　　آن کـه سبط مصطفیؐ و نور چشم مرتضیؑ ست

هست عمم جعفر طیار کاندر با غ خلد　　　دائـمـا پـرواز او تـا آستـان کبریـاست

حـمـزه سـرخیـل شهیـدان با شدم عم پدر　　　اینچنین اصل و نسب در جمله عالم کراست

ای ستمکاران سنگین دل که اخلاق شما　　　بیـوفـائی و نفاق و حیله و جور و جفاست

جمله فرزندان و خویشان و عزیزان مرا　　　قتـل کـردیـد این چه آئین است این طغیان کراست

وین زمان بهر هلاك من كمر بسته اید　　　کشتن من در کدامین مذهب و ملت رواست

تشـنه لب رفتند یاران و من از پی میروم　　　در قیامت حضرت حق حاکم ما و شماست (۲)



(۱) روضۃ، ص ۳۲۶

(۲) روضۃ الشہدا، ص ۳۲۷۔

سلجوقی عہد میں عزاداری کا رواج:

عربی میں مقتل کی کئی کتابیں موجود تھیں اور ان میں رجزوں اور مرثیوں کے اصل عربی اشعار بھی موجود تھے، اس زمانے کے تمام پڑھے لوگ عربی زبان سے بہ خوبی واقف تھے۔ ان حالات میں فارسی مقتلوں کا لکھا جانا اور ان میں عربی نظموں کا فارسی ترجمہ شامل کیا جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ کتابیں عوام کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اور اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں ایران میں عزاداری کا عام رواج تھا۔

سلطان سنجر سلجوقی خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے چالیس برس ایران میں سلطنت کی اور بادشاہ ہونے سے پہلے کوئی چوبیس برس خراسان پر حکومت کر چکا تھا، اس کی سلطنت کے آخری سال یعنی ۵۵۱ھ (۱۱۵۶ء) میں قاضی حمید الدین ابو بکر بلخی نے کتاب ''مقامات حمیدی'' لکھی۔ اس کا تیئیسواں مقامہ تعزیت کے بیان میں ہے اور اس میں ایک ایک عالم دین کی وفات پر اہل شہر کی سوگواری کا حال یوں بیان کیا گیا ہے:

''جمعی دیدم نشسته و استاده و عمامه های خواجگی از سر نهاده و جزع و فزع و جوش و خروش از میدان سمك به ایوان سماك رسانیده، آسمان در آن ماتم جامه غوطه کرده و مرد ملك چشم در آب غوطه خورده ، خاك اقدام تاج فرق هاشده و خون دیده ها غالیهٔ رخسار گشته ، چون آوازهٔ آوازها به غایت رسیده و آن نفیر و

زفیر بہ نہایت کشیدہ ، و آن حادثہ از حادثۂ احد و حنین و آن مصیبت از مصیبت حسنؑ و حسینؑ در گذشت، پیری صاحب دل از میانِ خلق برخاست و عروس زبان را بہ زیور سخن بیاراست"۔(۱)

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حسنین کی عزاداری مجمع کے ساتھ بالاعلان ہوتی تھی۔ ماتمیوں کے گروہ سر برہنہ نکلتے، خوب گریہ وزاری کرتے اور سر پر خاک ڈالتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سوگواروں کے ایک گروہ سے یہ سب باتیں منسوب کرتے وقت مصنف کا ذہن حسن و حسین کی طرف منتقل نہ ہوتا۔

مقامات حمیدی کا مصنف خراسان کے شہر بلخ کا رہنے والا تھا اور اس نے مذکورہ بالا فرضی واقعہ عراق عجم کے شہر اصفہان کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس سے بھی یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سنجر سلجوقی کے عہد میں ایران کے مختلف حصوں میں امام حسین کی عزاداری علانیہ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مرثیے بھی ضرور کہے گئے ہوں گے۔

حکیم سنائی غزنوی کے اشعارِ مرثیہ:

سلطان سنجر ہی کے زمانے میں تقریبا ۵۲۵ ہجری (۱۱۳۱ء) میں غزنی یا بلخ کے رہنے والے فارسی کے نامی شاعر حکیم سنائی نے اپنی مشہور صوفیانہ مثنوی حدیقۃ الحقیقت لکھی جو حدیقۂ سنائی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دوسرے باب میں ذکر الحسین، صفۃ قتل الامیر السید الحسین بن علیؑ اور صفۃ الکربلا کے عنوانوں کے تحت جو اشعار لکھے گئے ہیں، ان کے مجموعے کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ اس مقام کے کچھ شعر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان شعروں کے بیچ بیچ سے بہت سے شعر طوالت کے خوف سے حذف کر دیئے گئے ہیں:

---

(۱) مقامات حمیدی، مطبع نول کشور، لکھنو، ص ۱۲۱، ۱۹۲۳ء۔

پسر مرتضی امیر حسین | که چنونی نه بوده در کونین
قابل راز حق رزانت او | مهبط وحی حق امانت او
نبوی جوهری زکبر و جلال | یافته از کمال صدق جمال
به سروروی و سینه و دیدار | راست مانند احمد مختارؐ
عقل در بند عقد پیمانش | بوده جبریل مهد جُنبانش
مصطفیؐ مرورا کشیده به دوش | مرتضیؑ پرورديده در آغوش
به رخش انس یافته زهراؑ | کرده بر جانش سال و ماه دعا
دشمنان قصد جان او کردند | تا دمار از تنش بر آوردند
عمر وعاص از فساد رایی زد | شرع را زود پشت پایی زد
بر یزید پلید بیعت کرد | تا که از خاندان بر آرد گرد
شرم و آزرم جملگی برداشت | جمع از دشمنان بر و بگماشت
تا مراو را به نامه و به حیل | از مدینه کشید در منهل
کربلا چون مقام و منزل | ساخت تا که آل زیاد بَروی تاخت
ره آب فرات بر بستند | دل او از عناد غم خستند
شمر و عبد الله زیاد لعین | روح شان جفت باد با نفرین
بر کشیدند تیغ بی آزرم | نز خدا ترس و نز خلائق شرم
سرش از تن به تیغ ببریدند | و نداران فعل سود می دیدند
به دمشق اندر آن یزید پلید | منتظر بود تا سرش برسید
پیش بنهاد و شادمانی کرد | تکیه بر دنییٰ و امانی کرد
دست شومش بر آن لب و دندان | زدقصب از نشاط لب خندان
کینه هائی تو جسته ای ز حسینؑ | خواسته کینه های بدر و حنین

شهربانو و زینب گریان — مانده در فعل ناکسان حیران

علی الاصغر ایستاده به پای — و ان سگان ظلم را بداده رضای

سر برهنه بر اشتر و پالان — پیش ایشان ز درد دل نالان

عمر و عاص و یزید و ابن زیاد — همچو قوم ثمود و صالح و عاد

هیچ ناورد در ره بیداد — مصطفیؐ را و مرتضیؑ را یاد

راه آزرم و شرم بر بسته — عهد و پیمان شرع بشکسته

حرمت دین و خاندان رسولؐ — جمله برداشته ز جهل و فضول

تیغ ها لعل گون ز خون حسینؑ — چه بود در جهان بتر زین شین

زخم شمشیر و نیزه و پیکان — بر سر نیزه سر بجای سنان

آل یٰسین بداده یکسر جان — عاجز و خوار و بی کس و عطشان

فاطمهؑ روی ها خراشیده — خون بباریده بی حد از دیده

مصطفیؐ جامه جمله بدریده — علیؑ از دیده خون بباریده

حسنؑ از زخم کرده سیله کبود — زینب از دیده ها برانده دو رود

شهر بانو یسیر گشته حزین — علی الاصغر آن دو رخ پُر چین

عالمی بر جفا دلیر شده — رو به مُرده شر زه شیر شده

کافرانی در اول پیکار — شده از زخم ذوالفقار فگار

همه را بر دل از علیؑ صد داغ — شده یکسر قرین طاغی و یاغ

کین دل باز خواسته ز حسینؑ — شده قانع بدین شماتت و شین

هر که راضی شود به کردهٔ زشت — نزد آن کس چه دوزخ و چه بهشت

خیره راضی شود به خون حسینؑ — که فزون بود و قعش از ثقلین

پس تو گوئی یزید میرمن است — عمر و عاص پلید پیر من است

آن کہ را عمر و عاص باشد پیر | یا یزید و پلید باشد میر
مستحق عذاب و نفرین است | بدرہ و بد فعال و بددین است
لعنت دادگر بر آن کس باد | کہ مرااو را کنند بہ نیکی یاد
من نیم و دست دار شمر و یزید | زآن قبیلہ منم بہ عھد بعید
از سنائی بہ جان میر حسینؑ | صد ھزاران ثنا ست دائم دین (۱)

خواجہ عطار نیشاپوری کے اشعار مرثیہ:

حدیقۂ سنائی کی تصنیف کے کوئی سو برس بعد ایران کے دوسرے نامور صوفی شاعر خواجہ فریدالدین عطار نیشاپوری نے مثنوی ''خسرو نامہ'' لکھی جس کا دوسرا نام ''ہرمز وگلرخ'' ہے۔ اس میں جو اشعار امام حسینؑ کی منقبت میں کہے گئے ہیں ان میں مرثیت کا عنصر موجود ہے، چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

امامی کافتاب خافقین است | امام ماہ تاماھی حسینؑ است
چو خورشیدی جھان را خسرو آمد کہ | نہ معصوم پاکش پس رُو آمد
شب از موی سیاھش تیرہ گشتہ | زرویش ماہ روشن خیرہ گشتہ
جھان افروز این خورشید رویش | جھان جان فدای روی و مویش
دو گیتی را سواد طرہ اش زین | مطھر ذات او از تھمت شین
لبش یاقوتُ بدیا قوت جان بود | رسولؐ حق بر آن گوھر فشان بود
ببین سنگین دلان چہ طرف بستند | کہ آن دُرج گھر درھم شکستند
ستمگر بی وفا چرخ جفاکیش | چنین بازی چرا می برداز پیش
سر فرزند پیغمبرؐ بُریدن | و زان پس دعوی ایمان نمودن
نہ بد در حق آن احرار کردند | کہ کار خویشتن دشوار کردند (۲)

---

(۱) حدیقۃ الحقیقۃ، مطبع میرزا ابوطالب شیرازی، ص ۱۴۶، ۱۵۱، بمبئی ۱۸۵۹ء۔
(۲) خسرو نامہ، مطبع ثمر ہند لکھنو ۱۸۶۷ء، ص ۴۳، ۴۴۔

تاتاری یا ایلخانی عہد کا ایک مرثیہ گو: اوحدی

ہلاکو خان نے ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں عباسی خلافت کا خاتمہ کر کے ایران میں تاتاری ایلخانیوں کی سلطنت قائم کی، اس خاندان کے بادشاہ بعد کو مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے بعض شیعی رجحانات رکھتے تھے۔ ملا حسین واعظ کاشفی کے قول کے مطابق اس عہد کا ایک صوفی شاعر شیخ اوحدی ہر سال محرم میں شہدائے کربلا کی تعزیت میں چند شعر کہا کرتا تھا۔ (۱)

ایران میں اوحدی تخلص کا ایک ہی شاعر (۲) مشہور ہے جو مراغہ کا باشندہ تھا۔ دولت شاہ اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتا ہے کہ شیخ اوحدی شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید شیخ اوحد الدین کرمانی کا مرید تھا۔ اس نے اپنا تخلص اپنے مرشد کے نام سے اخذ کیا تھا، معرفت اور سلوک میں کامل ہونے کے ساتھ وہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس کا دیوان دس ہزار بیت پر مشتمل تھا۔ اس کا کلام نہایت پر کیف تھا اور وہ عاشقانہ غزلیں اور عارفانہ اشعار خوب کہتا تھا۔ اس نے حدیقۂ سنائی کے طرز پر مثنوی ''جام جم'' اصفہان میں کہی تھی جس کو یہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ایک مہینے کے اندر قدردانوں نے اس کی چار سو نقلیں کر لیں، یہ مثنوی حجم میں کم ہونے کے باوجود بڑی بڑی قیمتوں کی خریدی گئی۔ وہ موحد تھا اور موحدانہ شعر کہتا تھا۔ اس کا ترجیع بند موحدوں میں بڑی شہرت رکھتا ہے اس نے ایک دہ نامہ کہہ کر محقق طوسی خواجہ نصیر الدین کے پوتے خواجہ ضیاء الدین یوسف کے نام معنون کیا، جو بہت نازک اور لطیف ہے۔ شیخ اوحدی نے

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۴۸۔

(۲) تذکرہ دولت شاہ، طبع بمبئی میں خواجہ فخر الدین سبزواری کا تخلص بھی وحدی لکھ دیا گیا ہے مگر یہ صحیح نہیں، اس کا تخلص اوحد تھا جیسا کہ اسی نسخے میں اس کے قصیدے کے آخری شعروں میں موجود ہے (دیکھو ۱۹۴ تا ۱۹۶)۔

ارغون خان کے زمانے میں ظہور کیا اور غازان خان کے عہد سلطنت میں ۶۹۷ھ میں انتقال کیا، اس کا مزار اصفہان میں ہے اور وہاں کے لوگ اس مزار سے عقیدت رکھتے ہیں۔(۱)

ملا جامی نے نفحات الانس میں اوحدی کا جو مختصر حال لکھا ہے وہ بعض جگہ دولت شاہ کے بیان سے مختلف ہے۔ دولت شاہ نے اوحدی کو مراغی کا بتایا ہے اور جامی نے اصفہانی، دولت شاہ نے اصفہان کو اس کا مدفن بتایا ہے اور جامی نے مراغہ کو۔ یعنی دولت شاہ کے قول کے مطابق اوحدی کا وطن مراغہ اور مدفن اصفہان تھا اور ملا جامی کے قول کے مطابق اس کا وطن اصفہان اور مدفن مراغہ تھا۔

اوحدی کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی دونوں کا بیان مختلف ہے۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ اس نے غازان خان (۶۹۴ھ تا ۷۰۳ھ/ ۱۲۹۵ھ تا ۱۳۰۴ھ) کے عہد میں انتقال کیا اور جامی کا قول ہے کہ اس کے مزار پر اس کا سال وفات ۷۳۵ھ لکھا ہوا ہے (۲) قاضی نور اللہ شوشتری نے بھی اس معاملے میں دولت شاہ سے اختلاف کیا ہے، اس لئے کہ اوحدی کی مثنوی ''جام جم'' میں سلطان ابو سعید چنگیزی کی مدح میں ایک فصل موجود ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

در جہان تا کہ سایہ شاہ است　　جور مانند سایہ در چاہ است

دو جہان را صلات عید زدند　　سکہ بر نام بو سعید زدند(۳)

سلطان ابو سعید نے ۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) سے ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) تک سلطنت کی۔ اس طرح دولت شاہ کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ اوحدی کی وفات ۶۹۷ھ میں واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ اوحدی نے جام جم کا سال تصنیف ایک شعر میں ۷۳۳ھ بتایا ہے، وہ شعر یہ ہے:

چون ز تاریخ بر گرفتم فال　　هفت صد رفته بود و سی و سه سال

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ، مرتبہ پروفیسر براون، ص ۲۱۰ تا ۲۱۳۔

(۲) نفحات الانس، مطبع سیدی، بمبئی، ۱۲۸۴ھ، ص ۳۹۶۔

(۳) مجالس المومنین مجلس ششم۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ۷۳۳ھ میں زندہ تھا۔ اس صورت میں جامی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اوحدی نے ۷۳۸ھ میں انتقال کیا۔

ملا حسین واعظ نے شیخ اوحدی کے اشعارِ تعزیت میں سے یہ تین شعر نقل کئے ہیں:

هر سال تازه می شود این درد سینه سوز　　سوزی که کم نه گردد و دردی که بی دواست

اندر شفق هلال محرم ببین که هست　　چون نعل اسپ شه که به خون غرقه گشت راست

ای تشنهٔ فرات یکی دیده باز کُن　　کز آبِ دیده بر سر قبرِ تو دجله ها ست(۱)

جس نظم سے یہ شعر لئے گئے ہیں اس کو مرثیہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاسکتا۔ ان شعروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاتاریوں کے عہد حکومت میں بھی ایران میں محرم کے دنوں میں امام حسینؑ کی عزاداری ہوتی تھی اور شہدائے کربلا کے مرثیے کہے جاتے تھے۔

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۴۸۔

تیموری عہد کا ایک مرثیہ گو: سلیمی

ایلخانی دور کے بعد تیموری حکومت قائم ہوئی۔ امیر تیمور عام طور پر تعزیہ داری کا بانی سمجھا جاتا ہے (۱) اس کے بعد اس کی اولاد کوئی سو برس تک ایران کے مختلف حصوں پر حکمرانی کرتی رہی، ان کے عہد میں عزاداری کا بہت رواج تھا اور مجالس عزا کثرت سے ہوتی رہتی تھیں۔ تیمور کے بیٹے شاہ رخ (۸۰۷ھ۔ ۸۵۰ھ/۱۴۰۴ء۔ ۱۴۴۷ء) کے عہد میں مولانا حسن سلیمی ایک نیک نہاد، نرم دل، قادر الکلام شاعر تھا، حضرت علیؑ اور ائمہ معصومین کی مدح میں اس نے اچھے اچھے قصیدے کہے ہیں۔ ولایت نامے، تو جیسے اس نے کہے ویسے دوسرے مداحوں سے نہ ہو سکے، وہ تون کا باشندہ اور سبزوار میں مقیم تھا کچھ دن سرکاری ملازمت کرتا رہا پھر ایک واقعے سے متاثر ہو کر اس نے ملازمت ترک کر دی اور صلحا و فقرا کے لباس میں سیر و سیاحت میں مصروف ہو گیا۔ حج کا فریضہ بجالایا اور ائمہ علیہم السلام کے مزاروں کی زیارت سے مشرف ہوا۔ ۸۵۴ھ میں مشہد مقدس کی زیارت کو جا رہا تھا کہ راستے میں انتقال کیا اور سبزوار میں دفن کیا گیا۔

سلیمی کے قصیدے:

میں نے ایک مجموعہ ایسی فارسی نظموں کا دیکھا ہے جن میں حضرت علیؑ اور دوسرے ائمہ کے

---

(۱) ہندوستان میں تعزیہ کے ایک مخصوص اصطلاحی معنی ہیں یعنی امام حسینؑ کے روضہ کی شبیہ جو عزاداری کے سلسلے میں بالعموم امام باڑوں میں رکھی جاتی ہے کہتے ہیں کہ اس طرح کی شبیہ سب سے پہلے امیر تیمور نے بنوائی تھی۔ وہ جب امام حسینؑ کے روضہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا اور کربلائے معلی نہ جا سکتا تھا تو اس شبیہ کی زیارت کر لیتا تھا۔

معجزے نظم کئے گئے ہیں(۱) اس مجموعے میں ایک مثنوی اور پندرہ قصیدے سلیمی کے بھی ہیں۔ایک قصیدے کا مطلع ہے:

تبارك الله ز آثار صنع صانع اکبرؔ که داد این همه نور و ضیا به خاك مکدر(۲)

یہ دوسو چالیس شعر کا طولانی قصیدہ ہے اور اس میں حضرت علیؑ کے کئی معجزے بیان کئے گئے ہیں ،اس کے آخری شعر میں اس کا سال تصنیف ۸۴۳ھ بتایا گیا ہے۔

ز سال هشت صد و چهل بود و سه از هجرت که این قصیده در آمد به نظم و گشت محرّر

ایک دوسرے قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

هر کرا اندر ازل بخت و سعادت گشت یار دوستی مصطفیؐ و مرتضیؑ کرد اختیار

اس قصیدے میں یہ مشہور روایت بھی نظم کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن حسنینؑ نے نئے لباس کی فرمائش کی اور جبریل دو بہشتی حلّے لائے ،ایک سبز اور ایک سرخ۔حسنؑ نے سبز اور حسینؑ نے سرخ حلّہ پسند کیا۔جبریل نے اس کا سبب بیان کیا جس کو سن کر حضرت فاطمہؑ بہت مغموم ہوئیں اور رسالت مآبؐ سے دریافت کیا کہ میرے فرزندوں کی شہادت کے وقت عزیزوں اور کہنے والوں میں سے کون کون ان کے پاس موجود ہوگا ،آپ نے جواب دیا کہ اس وقت نہ میں ہوں گا نہ تم ہوگی ،نہ علیؑ ہوں گے۔حضرت فاطمہؑ نے پوچھا کہ پھر میرے یتیم کا سوگ کون منائے گا ،اس سوال کا جواب سلیمی نے ان دو شعروں میں لکھا ہے:

مصطفی گفتا که جمعی امتان باوفا کز میان جان و دل باشند مارا دوستدار

بر سر هر سال اول همه محرم تا دهم بهر ایشان تعزیت دارند اندر هر دیار

ان شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلیمی کے زمانے میں یعنی تیموریوں کے عہد سلطنت میں

---

(۱) اس مجموعے کا ایک قلمی نسخہ لکھنو یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) مجموعہ مذکورہ بالا ،ورق ۲۲۔

ایران میں عزاداری کا عام رواج تھا اور محرم کا پہلا عشرہ عزاداری کے لئے مخصوص تھا۔

سلیمی کے مرثیے:

میرے کتب خانے میں فارسی مرثیوں کا ایک بہت خوش خط مجموعہ ہے جس کے ہر صفحے پر طلائی جدولیں کھنچی ہوئی ہیں۔ اس میں ایک سلام اور تین مرثیے سلیمی کے بھی ہیں۔ یہ سب نظمیں غزل یا قصیدے کی شکل میں ہیں۔

مرثیوں میں دس بارہ شعروں سے زیادہ نہیں ہیں، مگر سلام میں ۴۳ شعر ہیں، ایک مرثیہ نقل کیا جاتا ہے:

روز جزا ز خاك چو سر بر کند حسینؑ　　　با اهل بیت روی به محشر کند حسینؑ
گلگون کفن چو لاله رود نزد مصطفیؐ　　　رخساره ز آب دیدهٔ خود تر کند حسینؑ
از قتل خویش و قتل جوانان اهل بیت　　　تفصیل نزد ساقی کوثر کند حسینؑ
با جد خویش از سر سوز و فغان و آه　　　نقل گلو بریدن اصغر کند حسینؑ
آه از دمی که واقعهٔ اهل خیمه را　　　خاطر نشان تمام به مادر کند حسینؑ
فریاد از آن زمان که ببیند رخ حسینؑ　　　افغان ز بهر قاسم سرور کند حسینؑ
افتد فغان و زلزله در هفت آسمان　　　چون نقل از حکایت اکبر کند حسینؑ
احوال تشنگان بیابان کربلا　　　یك یك بیان به ساقی کوثر کند حسینؑ
از دیده خون ببار سلیمیؔ در این عزا　　　تا بر تو رحم در صف محشر کند حسینؑ

میرے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض ہے جس میں مجلسوں میں پڑھنے کے لئے فارسی نثر میں روایتیں لکھی گئی ہیں اور بہت سے مرثیے نوحے وغیرہ بھی نقل کئے گئے ہیں۔ بیاض کے آخر میں جن لوگوں کی سلامتی اور عمر و دولت کی زیادتی کے لئے فاتحہ پڑھنے کی درخواست اہل مجلس سے کی گئی ہے ان میں وزیر الممالک نواب بہادر ہزبر جنگ، نوازش علی خان بہادر سردار جنگ، قاسم علی خان بہادر

قیام جنگ اور نواب عالیہ بہو بیگم صاحبہ کے نام بھی ہیں (۱) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بیاض آصف الدولہ فرمان روائے اودھ کے عہد حکومت میں لکھی گئی تھی۔ اس میں ایک مرثیہ سلیمی کا بھی ہے۔اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

روز عزاست امروز جان در بلاست امروز　　غوغای روز محشر در کربلا ست امروز

ای مومنان بگریید اندر دهه محرم　　کاین ماتم از برای آل عباست امروز

گرییـد ای محبان در ماتم شهیدان　　زاری کنید و افغان روز عزاست امروز

فرزند شاه مردان افتاده در بیابان　　اندر تنش جراحت بی منتهاست امروز

کو مصطفیؐ که بیند اولادِ خویشتن را　　سرها بریده از تن بر نیزه هاست امروز

گوش فلک سلیمیؔ کر شد زبانگِ نوحه　　گویا تمام عالم ماتم سراست امروز

کتاب ''حزن المومنین'' کے مولف نے اس مرثیے کا صرف مطلع لکھا ہے اور اس کو غلطی سے ملا مقبل کی طرف منسوب کر دیا ہے اور اسی زمین میں کسی کا یہ مطلع نقل کیا ہے:

چه کربلا ست امروز چه پُر بلاست امروز　　سر حسینؑ مظلوم از تن جدا ست امروز

تیموری عہد کا سب سے بڑا مرثیہ گو: آذری اسفرائنی

پہلا طولانی اور بلند پایہ فارسی مرثیہ جس کو ایران میں مدتوں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی وہ سلیمی سبزواری کے ہم عصر شیخ آذری اسفرائنی کا کہا ہوا ہے۔ وہ امیر تیمور کے عہد میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا۔ نام شیخ حمزہ تھا۔ لقب میں اختلاف ہے۔ کوئی برہان الدین لکھتا ہے، کوئی جلال الدین اور کوئی نور الدین خاندانی اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ اس کے دادا اسفرائن میں صاحب اختیار

---

(۱) بہو بیگم صاحبہ آصف الدولہ کی ماں اور نوازش علی اور قاسم علی خان آصف الدولہ کے ماموں تھے۔

اور باپ خواجہ علی مِلک بیہق میں سربدار(۱) تھے۔ شیخ نے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں بڑی محنت اور ریاضت کی، نکات حدیث اور رموزِ طریقت شیخ محی الدین طوسی سے حاصل کیے اور ان کی وفات کے بعد ایک مدت تک سید نعمت اللہ کی خدمت میں حاضر اور سلوک میں مشغول رہا اور فقرا اور اہل اللہ کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ خود شیخ کا قول ہے کہ میں آذر کے مہینے میں پیدا ہوا تھا، اس مناسبت سے آذری تخلص رکھا۔(۲) اس کے ہم عصروں میں خواجہ علی شہاب بڑا فاضل اور شیریں کلام شاعر تھا، اس میں اور شیخ حمزہ آذری میں مشاعرہ و مناظرہ ہوتا تھا۔ ایک دن ایک مجلس میں جہاں بہت سے فاضل اور شاعر جمع تھے آذری نے شہاب کو مخاطب کر کے یہ رباعی فی البدیہ کہی:

سر دفترِ اربابِ هنر خواجه علیؑ ست — ای آنکه ترا لطفِ طبیعت ازلی ست

تو خواه مرا پسند و خواهی مپسند — دانند همه که حمزه استاد علیؑ ست

خواجہ شہاب نے اس کے بعد فوراً یہ رباعی کہی:

ای حمزه بدان که عرش حق جای علیؑ ست — بر دوش رسولؐ از شرف پای علیؑ ست

استاد علی ست حمزه در ...... — صد حمزه به علم و فضل لالای علیؑ ست

آذری نے بادشاہوں اور امیروں کی مدح میں قصیدے لکھے اور بڑے بڑے صلے پائے۔ تیمور کا جانشین شاہ رخ سلطان اس کی بہت تعریف و تعظیم کرتا تھا، اس نے آذری کو ملک الشعرا کا خطاب بھی دیا تھا، بعد کو آذری کی طبیعت دنیا سے ہٹ گئی، اس نے فقر اختیار کرلیا اور ریاضت و سیاحت میں مصروف ہو گیا۔ دو مرتبہ پیدل حج کیا اور ایک سال بیت اللہ کا مجاور رہا۔ اسی زمانے میں مناسک حج

---

(۱) سربدار خاندان نے تقریباً پچاس برس سبزوار اور اس کے قرب و جوار کے علاقے پر حکم رانی کی۔ اس خاندان کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۷۳۷ھ (۱۳۳۷ء) میں امیر عبدالرزاق بیہقی نے علم بغاوت بلند کیا اور مصنف روضات الجنات کی روایت کے مطابق یہ کہنا شروع کیا کہ جمعی مفسدان استیلا یافتہ بر خلائق ستم می کنند اگر توفیق یابیم دفع ظلم ظالمان نمائیم والا سر خود را بردار بینیم کہ دیگر تحمل تعدی و ظلم نداریم، اسی قول کی بنا پر امیر عبدالرزاق اور اس کے جانشین سربدار کہلانے لگے (تاریخ ادبیات ایران، از براون، جلد سوم، ص ۱۷۸، ۱۷۹)۔

(۲) ہفت اقلیم۔

اور تاریخ کعبہ کے بیان میں کتاب ''سعی الصفا'' حرم میں بیٹھ کر لکھی، مکے سے واپسی کے بعد وہ ہندوستان آیا اور کچھ زمانہ احمد شاہ بہمنی کے دربار میں بڑی عزت و حرمت کے ساتھ بسر کیا۔

آذری ہندوستان میں:

محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ۸۳۲ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ سالک مسالک طریقت شیخ آذری اسفرائنی ان دنوں سلطان احمد شاہ بہمنی کا ہم رکاب تھا اور بادشاہ اور اس کے آباد کئے ہوئے شہر احمد آباد بیدر کی مدح میں قصیدے کہتا اور صلے پاتا تھا۔ اس نے سلطان کے حکم سے بہمن نامہ لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر جب سلطان کے حالات تک پہنچا تو کتاب کو بادشاہ کے حضور میں پیش کر کے اپنے وطن واپس جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے کہا کہ سید محمد گیسو دراز کے انتقال کا مجھ کو بہت صدمہ ہے۔ تمہاری صحبت سے میرا غم غلط ہو جاتا ہے اب تم اپنے فراق کے غم میں مجھے مبتلا نہ کرو۔ شیخ آذری نے بادشاہ کے اس التفات سے متاثر ہو کر واپسی کا ارادہ ترک کیا اور اپنے فرزندوں کو بھی یہیں بلا لیا۔ کچھ دن بعد جب احمد آباد کے نئے شہر میں نیا قصر حکومت تیار ہو گیا تو شیخ آذری نے اس کی تعریف میں دو شعر کہے جو بادشاہ نے پسند کئے (۱) اور شاہزادہ علاء الدین کی سفارش سے شیخ کو وطن جانے کی اجازت دے دی، شاہی حکم کے مطابق چالیس ہزار روپے شیخ کے سامنے رکھے گئے۔ شیخ نے ان کو دیکھ کر کہا: لا یحمل عطایاکم الا مطایاکم ''(تمہارے عطیوں کو تمہارے ہی بار برداری کے جانور اٹھا سکتے ہیں) بادشاہ مسکرایا اور سفر خرچ کے لئے بیس ہزار روپے اور دیئے اور خلعت اور پانچ ہندی غلام بھی عنایت کئے۔

---

(۱) طبقات ناصری میں ہے کہ اس موقعے پر متعدد شاعروں نے اس عمارت کے کتبے کے لئے اچھے اچھے شعر کہے، آذری نے بھی چند شعر کہے جن میں سے دو یہ ہیں:

حبذا قصر مشیّد کہ ز فرطِ عظمت   آسمان پایہ ای از سدّۂ این درگا است

آسمان هم نتوان گفت که ترک ادب است   قصر سلطان جهان احمد بهمن شاه است

فرشتہ نے غالباً انہیں دو شعروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شیخ آذری نے چلتے وقت بادشاہ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک زندہ رہوں گا بہمن نامہ کی تصنیف میں مشغول رہوں گا۔ شیخ نے یہ وعدہ پورا کیا اور ہر سال جتنا قصہ لکھتا تھا خراسان سے دکن بھیج دیا کرتا تھا۔ ہمایوں شاہ بہمنی تک کا حال شیخ آذری کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد کے بادشاہوں کا حال بہمنی سلطنت کے اختتام تک ملا نظری، ملا سامعی اور دوسرے شعرا وقتاً فوقتاً لکھ لکھ کر ''بہمن نامہ'' میں شامل کرتے رہے۔

آذری کی واپسی، عزلت گزینی اور وفات:

ہندوستان سے واپس جا کر شیخ آذری نے اپنے وطن اسفرائن میں خلوت اور قناعت کی زندگی اختیار کر لی، تیس پینتیس برس تک سجادۂ عبادت پر بیٹھا رہا، کبھی کسی کے دروازے پر کوئی غرض لے کر نہیں گیا۔ اصحاب دین و دولت اور ارباب ملک و ملت خود اس کی صحبت کے طالب رہتے تھے اور اس کی خدمت میں اپنی التجائیں لے جاتے تھے۔(۱) اس نے اسفرائن میں کئی عمارتیں اور سرائیں بنوائیں اور بہت سے کار خیر انجام دیئے (۲) شہزادہ الغ بیگ میرزا کی غیر معمولی قوت حافظہ کے بیان میں دولت شاہ نے شیخ آذری کی زبانی لکھا ہے کہ میرے ماموں صاحب قران تیمور گورگان کے قصہ خوان تھے۔ میں ان کے ساتھ قراباغ میں رہتا تھا وہیں شاہزادہ الغ بیگ میرزا کی خدمت میں رسائی ہوئی۔ چند سال وہاں رہا۔ بچپن کا زمانہ تھا، شاہزادے کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور قصے کہانیاں کہا کرتا تھا۔ شاہزادہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ ۸۵۲ھ میں جب الغ بیگ نے خراسان فتح کیا اور اسفرائن میں نزول فرمایا تو میں اس کی خدمت میں دوڑا گیا۔ میں اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا اور فقرا اور صلحا کے لباس میں تھا، مگر بادشاہ نے دور سے مجھ کو دیکھتے ہی سلام اور مزاج پرسی کے بعد فرمایا کہ اے درویش تو میرا قدیم مصاحب اور جلیس معلوم ہوتا ہے۔ کیا تو ہمارے قصہ خواں کا بھانجا نہیں ہے؟ مجھے بادشاہ کی

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ۔

(۲) تاریخ فرشتہ۔

ذہانت اور قوت حافظہ پر تعجب ہوا اور میں نے جواب دیا جی ہاں میں وہی ہوں پھر قراباغ وغیرہ کے قصے نکلے اور جو کچھ مجھ کو یاد تھا میں نے بیان کیا۔(۱)

شیخ آذری نے اسی بیاسی اور بہ قول بعضی اٹھاسی برس کی عمر پائی اور تیمور کے پروتے سلطان علاء الدولہ بن بایسنقر میرزا کے عہد حکومت میں قصبۂ اسفرائن میں ۸۶۶ھ میں انتقال کیا۔ اس کی وفات پر خواجہ افضل الدین اوحد مستوفی نے یہ قطعۂ تاریخ کہا:

دریغا آذری شیخ زمانہ　　　کہ مصباح وجودش گشت بی ضو

چراغ دل بہ مفتاح جیاتش　　　بہ انواع حقائق داشت پرتو

چو او ثانی خسروؔ بود در شعر　　　از آن تاریخ فوتش گشت خسرو(۲)

دولت شاہ لکھتا ہے کہ شیخ آذری نے اپنی جائداد اور املاک صلحا، فقرا، زہاد اور طلبا کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس کے روضے میں فرش اور روشنی کا انتظام ہے اور درس وافادہ سے رونق رہتی ہے۔ زوار اس کے مرقد منور پر اپنی التجائیں لے جاتے ہیں اور سلاطین و حکام اس کے روضۂ مطہر کے مجاوروں سے احسان و شفقت سے پیش آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔(۳)

آذری کا استغنا:

عزت نفس اور استغنا آذری کی سیرت کے خاص جوہر تھے۔ ایک مرتبہ احمد شاہ بہمنی نے اس کو ایک لاکھ روپئے دینے کا حکم دیا۔ لوگوں نے کہا کہ تعظیم و تشکر کے طور پر بادشاہ کے سامنے زمین پر سر رکھو، شیخ نے منظور نہ کیا اور وہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ شاہزادہ سلطان محمد بن بایسنقر شیخ آذری کی زیارت کو گیا، شیخ نے عدل و فضل کے بارے میں مفید نصیحتیں کیں۔ شہزادے نے ایک بدرۂ زر نذر کیا مگر اس نے قبول نہ کیا اور کہا کہ مجھ کو اس کی حاجت نہیں اور یہ شعر پڑھا:

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ۔

(۲) ایضاً۔　　　(۳) ایضاً۔

کسی که قاف قناعت وطن چو عنقا کرد   کجا به سیم و زر دهر سر فرود آرد

کہا گیا کہ آپ کو حاجت نہیں ہے تو آپ یہ رقم مستحقین کو تقسیم کردیں، شیخ نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

زر که ستانی و بر افشانیش   هم به از آن نیست که نستانیش

آذری کی تصنیفیں:

دولت شاہ کا بیان ہے کہ شیخ آذری کا دیوان ملکوں ملکوں مشہور ہے، دیوان کے علاوہ شیخ نے نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھیں، مثلاً جواہر الاسرار، سعی الصفا، طغرای ہمایوں، عجائب الغرائب۔

سعی الصفا: سعی الصفا میں مناسک حج اور تاریخ کعبہ کا بیان ہے۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ کتاب آذری نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی، تقی اوحدی اس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے:

"اگرچه اعتماد بر آن کتاب نیست و بدان طریق مناسك حج درست نیست زیرا که نه بر نهج فقهای امامیه واقع است، اما طریق تفتیش مستعدانه است"۔

یعنی یہ کتاب قابلیت سے لکھی گئی ہے مگر فقہ امامیہ کے مطابق نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیخ آذری مذہب شیعہ کا پیرو نہ تھا۔

جواہر الاسرار: جواہر الاسرار، نوادر، امثال اور مشکل اشعار کی شرح وغیرہ کا مجموعہ ہے اس میں آذری نے خاقانی کے اس قصیدے کے مشکل شعروں کی بھی شرح کی ہے جس کا مطلع ہے:

فلك کج رو تراست از خطِّ ترسا   مرا دارد مسلسل راهب آسا

اور لکھا ہے کہ خاقانی اور فلکی ابو العلا گنجوی کے شاگرد تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ سعدی آخر عمر میں امیر خسرو سے ملنے کے لئے ہندوستان گئے تھے اور خسرو کو سعدی سے جو عقیدت تھی وہ حد تصور سے باہر ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ شعرائے متقدمین و متاخرین کے کلام میں ممکن ہے کہ سہو و خطا ہوگئی ہو، مگر عماد فقیہ کا کلام ان عیوب سے بالکل پاک ہے۔ اسی کتاب میں آذری نے مولانا شرف الدین رامی کا ایک

قصیدہ نقل کیا ہے جس میں شاعری کے تمام صنائع و بدائع آ گئے ہیں اور مولانا لطف اللہ نیشاپوری کی مندرجہ ذیل رباعی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ صنعت مراعاۃ النظر کی بے نظیر مثال ہے:

گل داد پرید درع فیروزہ بہ باد | وی جوشن لعل لالہ بر خاک افتاد
داد آب چمن خنجر مینا امروز | یاقوت سنان آتش نیلو فر داد(۱)

عجائب الغراب: آذری کی مثنوی کا نام دولت شاہ نے عجائب الغرائب لکھا ہے اور تقی کاشانی اور علی ابراہیم خان نے عجائب الدنیا، اس مثنوی کا ایک قدیم قلمی نسخہ میری نظر سے گذرا ہے، اس کا شعر ذیل بتاتا ہے کہ یہ مثنوی کتاب جواہر الاسرار کے بعد لکھی گئی تھی:

خرق عادات نیست در ہر کار | گفتہ ام در جواہر الاسرار

اس مثنوی کے مقدمے میں حسب ذیل اشعار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کے وقت آذری غزل، قصیدہ اور عشقیہ مثنوی کو ناپسند کرنے لگا تھا مگر وہ مثنویاں اس کو پسند تھیں جن میں حقائق و معارف کا بیان کیا گیا ہے، مثلاً نظامی کی مخزن اسرار، عطار کی منطق الطیر، سنائی کی حدیقۃ الحقیقۃ اور مولانا روم کی مثنوی معنوی:

صنعت شاعری بقول و غزل | بازی کودکان بہ لعب و مثل
ہر چہ فن قصیدہ و غزل است | قوت طبع را در آن عمل است
عمل مثنوی ست استعداد | نہ ہمیں ذکر خسرو و فرہاد
بلکہ باید در این سخن سنجی | از درِ علم و معرفت گنجی
تا کند در حکایت آن را خرج | ہمچو جمع خطوط اندر درج
مخزنی چون نظامیؔ از اسرار | منطق الطیر دان چو از عطارؔ
چون سنائیؔ حدیقۃ معنیٰ | بحری از مثنوی چو مولانا

---

(۱) جواہر الاسرار کے متعلق یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تذکرہ دولت شاہ اور ہفت اقلیم سے ماخوذ ہے۔

آگے چل کر تاریخ اور شاہنامے کو بھی بے وقعت قرار دیتا ہے کہتا ہے:

چیست تاریخ و نظم شهنامه　　قصه خوانی و علم و هنگامه
این دم آن خسروان کرد کوراند　　همچو بهرام جمله در گوراند

اپنی مثنوی کے متعلق کہتا ہے:

هست این نسخه مغز جمله علوم　　می شود مغز گون ازاو معلوم
صرف های خزانهٔ عالم　　اندر این لوح برده ام به قلم
نیست دروی حکایتِ خط و خال　　هست این قصهٔ جمال و کمال
هست ابواب این خجسته کتاب　　جمله حمدِ مفتح الابواب
قصهٔ دیگران چرا جویم　　هم از او گویم آنچه می گویم
نیست دروی بحز غرائب صنع　　هست یکسر همه عجائب صنع

آخری شعر بتاتا ہے کہ اس مثنوی میں قدرت کے غرائب اور عجائب کا بیان ہے۔ مصنف نے ان دونوں چیزوں کا مفہوم اور ان کا فرق یوں سمجھایا ہے:

هست امری غریب از آن نسبت　　که نه باشد وقوع آن عادت
عجب و حیرت است در انسان　　از قصوری که عاجز است در آن

یعنی غریب وہ امر ہے جو عادۃً واقع نہیں ہوتا اور عجیب وہ امر ہے جو انسان سے ہو نہیں سکتا، عجائب اور غرائب میں یہ امتیاز کرنا بتاتا ہے کہ آذری نے اس مثنوی کا نام ''عجائب الغرائب'' ہی رکھا ہوگا نہ کہ عجائب الدنیا۔

یہ مثنوی کوئی مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف عجائب و غرائب الگ الگ بیان کر دیئے گئے ہیں صرف بحر کل بیتوں کی ایک ہی ہے۔ اس کا جو نسخہ میں نے دیکھا ہے وہ آخر سے کم ہے۔ جتنا حصہ موجود ہے اس میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار شعر ہیں۔

دیوان آذری: آذری کا دیوان تیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا (۱) دولت شاہ کہتا ہے کہ آذری کا دیوان ملکوں ملکوں مشہور ہے۔ تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اس کے دیوان میں عاشقانہ اور عارفانہ غزلیں اور توحید، نعت، منقبت اور سلاطین کی مدح میں قصیدے ہیں۔ علی ابراہیم خان نے ان اصناف سخن میں رباعیات وقطعات ومراثی در تعزیۂ سید الشہداؑ کا اضافہ کیا ہے۔ قاضی نور اللہ شوشتری کا قول ہے کہ آذری کے اکثر قصیدے اہل بیت علیہم السلام کے مناقب میں ہیں۔

آذری کا ایک مشہور قطعہ: ذیل کا مشہور قطعہ جو بعض الفاظ کی تبدیلی اور بعض اشعار کے حذف کے ساتھ بہت جگہ نقل کیا گیا ہے، شیخ آذری کا کہا ہوا ہے:

اگرچہ شاعران از روی اشعار — زیک جام اند در بزم سخن مست
ولی با بادۂ بعضی حریفان — فریب چشم ساقی نیز پیوست
زبان معنی ایشان گہ نظم — دہان از گفتۂ صورت فرو بست
ہمہ غواص دریای کمال اند — کہ در بحر حقیقت افگنند شست
مبین یکسان کہ در اشعار این قوم — ورای شاعری چیزی دگر است (۲)

آذری کا مرثیہ: تذکرہ دولت شاہ کے علاوہ ریاض الشعرا، آتشکدہ، مجمع الفصحا، خلاصۃ الافکار، وغیرہ میں آذری کا ذکر ہے مگر اس کے مرثیے کا تذکرہ نہیں ہے، مجالس المومنین میں ذیل کے دو شعر اس تمہید کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں:

در مرثیہ حضرت امام حسین می فرماید:

سوراخ می شود دل ما چون گل حسین — ہر جا کہ ذکر واقعہ کربلا رود
گر خلق را خدای بگیرد بہ اولیا — ترسم کہ این معاملہ با انبیا رود

---

(۱) فہرست اشپرنگر، ص ۳۱۴

(۲) تذکرہ دولت شاہ

ان میں سے پہلا شعر آذری کے دوسرے منتخب اشعار کے ساتھ ریاض الشعرا میں بھی نقل کیا گیا ہے علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی یہ شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ آذری نے امام حسین کے مرثیے میں ایک ترکیب بند کہا ہے۔ جس میں یہ بیت بھی ہے اور اس بیت کے متعلق کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خواب دیکھا کہ حضرت رسولؐ خدا اصحاب کے ساتھ کہیں تشریف لئے جا رہے ہیں، میں نے ایک شخص سے حال دریافت کرنا چاہا مگر آنحضرتؐ خود متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ آذریؔ نے میرے فرزند کے مرثیے میں ایک بیت کہی ہے اس کے صلے میں میں اس کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں۔ (۱) یہ نقل ہفت اقلیم میں بھی ہے اور آزاد نے غالباً وہیں سے لی ہے۔

اس مرثیے کے دس شعر علی ابراہیم خان خلیل نے اپنے تذکرے صحف ابرہیم (۲) میں نقل کئے ہیں سب سے زیادہ مکمل صورت میں یہ مرثیہ تقی الدین محمد حسینی کاشانی کے تذکرے، خلاصۃ الاشعار (۳) میں ملتا ہے یہاں اس میں نو بند ہیں اور اشعار کی مجموعی تعداد چھیالیس ہے۔ دو بندوں میں چار چار شعر، چار بندوں میں پانچ پانچ اور تین بندوں میں چھ چھ شعر ہیں۔ ترکیب بند نظموں میں عموماً تمام بندوں کے شعروں کی تعداد برابر ہوتی ہے غالباً مولف تذکرہ نے کچھ شعر حذف کر دیئے ہیں، اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ روضۃ الشہدا میں قطعہ کے عنوان سے یہ دو شعر نقل کئے گئے ہیں:

سوراخ می شود دل ما چون گل حسین ۔۔۔ آنجا کہ ذکر واقعہ کربلا رود
آخر روا بود کہ ز سنگین دلان شام ۔۔۔ بر اہل بیت این ہمہ جور و جفا رود (۴)

پہلا شعر آذریؔ کے مرثیے کا ہے اس لئے دوسرا شعر بھی اسی مرثیے میں ہونا چاہئے تھا مگر خلاصۃ

---

(۱) خزانہ عامرہ۔

(۲) مشرقی کتب خانہ، بانکی پور، ورق ۲۲۸، الف۔

(۳) مشرقی کتب خانہ، بانکی پور، ص ۲۱۸۔

(۴) روضۃ الشہدا، ص ۸۲۔

الاشعار میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔افسوس ہے کہ انتہائی تلاش کے باوجود آذری کا دیوان کہیں نہ ملا اور اس کا مکمل مرثیہ ہاتھ نہ آیا، بہرحال یہاں خلاصۃ الاشعار سے یہ مرثیہ نقل کیا جاتا ہے:

ای دل حیات ما به محرم حرام شد   آری حساب عمر در این مه تمام شد

باز از فراق آل نبی آب چشم ما   چون خاک کربلا به بلا تیر خام شد

ماخود مدام غرقه طوفان محنت ایم   چون روز کوفیان که به صد حیله شام شد

بخت یزید نعرهٔ هل من مزید زد   در نکبت یزید بدین نکته تام شد

بدبخت را وسیله بی دولتی بس است   خاصه کنون که نوبت طوفان عام شد

ای بی بصر نگر که متاعی چه بد خرید

عیش ازل فروخت عذاب ابد خرید

آری بلا علامت اهل قبول شد   این حکم مهر برلغ آل رسول شد

گویا بلا فرا خور هر نا قبول نیست   درّی ست کان عطیهٔ صاحب قبول شد

هر کو ز اهل بیت نبیؐ عبرتی گرفت   از کاروبار دهر به کلّی ملول شد

زشتی به هر که روی نهاد از خصال

اوست آری بلای مرد به قدر کمال اوست

روزی که چتر روح به صحرای تن زدند   کوس بلا به نام حسینؑ و حسنؑ زدند

بی قیمتی و بد گهری کرده اند فاش   آنها که سنگ بر گهر بو الحسنؑ زدند

هرگز برا ز معیشتِ شیرین کجا خورند   آنها که تیشه بر کمر کوهکن زدند

بیخ حیاتِ خویش زدند آنکه از حسد   سروی چنان بلند به ظلم از چمن زدند

چون روز حشر خلق جهان سر بر آورند

آل رسولؐ داد به محشر بر آورند

این حکم اگر نه بر نهج شرع ما رود   آدم و آل بر سر این ماجرا رود

دُر خلق را خدای بگیرد به اولیا بیم است کاین معامله با انبیا رود

زین کار دوستان نبیؐ را خجالت است بر دشمنان آل نبیؐ تا چها رود

سوراخ می شود دل ما چون گل حسینؑ هر جا که ذکرِ واقعهٔ کربلا رود

چون بر زمین ز مقتل او داستان کنند بر آسمان نمازِ ملائك قضا رود

ای دل بسوز از غم و داد از جهان بر آر

و ز دیده آب از غم لب تشنگان بر آر

ای آبروی هر دو جهان خاكِ پای تو وی گشته آب خاك نشین در عزای تو

تا بر لبِ مبارکِ تو بسته گشت آب هر دم فرو رود به زمین از حیای تو

آوارهٔ جهان شده ابر سیه گلیم در برّو بحر گریه کنان از برای تو

با خونبهای تو چه کند خصم بد گهر وی گشته خونبهای تو هم خونبهای تو

تا تشنه لب به خواب شدی آب زندگی ماتم گرفت در ظلمات از برای تو

چون گلبن بلای حسینؑ از زمین شگفت

رو جانبِ فلك به مناجات کرد و گفت

یا رب حسینؑ تا نمك جان چشیده است جز تلخی از حلاوت دوران نه دیده است

یا رب تو آگهی که چها بر سر حسینؑ از دست روزگار مخالف رسیده است

بس نیست بیکسی و یتیمی که روزگار چندین هزار تیغ به خونم کشیده است

و آن گاه رو به سوی مدینه سلام کرد

و ز آب دیده سوی پیمبرؐ پیام کرد

یا مصطفیؐ حسینؑ تو در دام ابتلاست یا مصطفیؐ حسینؑ تو در کام اژدهاست

یا مصطفیؐ حسینؑ نه از اهل بیت تست؟ بر اهل بیت این همه ظلم و ستم چراست

یا مصطفیؐ رواست که فرزند تو حسینؑ در کربلا فتاده به صد محنت و بلاست

یا فاطمہ حسینؑ ترا روز آخر است | آخر بیا ببین که جگر گوشه ات کجاست

گرما به رغم بخت بدی در زمان تو

کردی همه فدای تو جانها به جان تو

آن دم چرا زمین و زمان سرنگون نه شد | خاك سیاه بر سر گردون دون نه شد

خونین چو گشت فرق جگر گوشهٔ رسولؐ | روی زمین چرا همه دریای خون نه شد

جان عزیز از تن او شد برون چرا | جان علوی او ز دو عالم برون نه شد

آن دم که آب بر لب او بسته شد چرا | همچون فرات چشمهٔ خور نیلگون نه شد

آه از دمی که زد به جفا شمر نابکار

بر بوسه گاه سیّدِ ما تیغ آب دار

ای آروزی دیدهٔ خونبار یا حسینؑ | نام تو مرهم دل افگار یا حسینؑ

بر عاصیان به چشم عنایت نگاه کن | ای نور چشم احمد مختار یا حسین

ما تشنگان مالك آب شفاعت ایم | در کربلای نفس گرفتار یا حسینؑ

وقت است اگر کنی نظری از کمال لطف | در کارِ آذریؔ گنهگار یا حسینؑ

گر شد حسینؑ دولت آلش مخلّد است

عالم همه مسخر آل محمدؐ است

مرثیۂ آذریؔ کی شہرت اور مقبولیت:

اس مرثیے کے متعلق ایک بزرگ کا خواب جو ''ہفت اقلیم'' اور خزانۂ عامرہ، سے اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اس سے ہر خوش عقیدہ مسلمان یہی نتیجہ نکالے گا کہ یہ مرثیہ بارگاہ رسالت میں مقبول ہوا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا آسان ہے کہ مسلمانوں میں اس مرثیے کو کتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔ مذہبی عقیدت سے قطع نظر ادبی حیثیت سے بھی یہ مرثیہ مدت دراز تک بے نظیر سمجھا گیا، تاریخ عالم آرای عباسی کا مصنف اسکندر بیگ جو شاہ عباس اعظم کا میر منشی اور ملا محتشم کاشی کا ہم عصر تھا، محتشم

کے مرثیے کی تعریف کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

"بہ مرثیۂ شیخ آذری علیہ الرحمہ کہ تا غایت ہیچ کس از شعرا تتبّع آن نتوانستند نمود، قلم نسخ کشیدہ"(۱)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آذرؔی کے مرثیے کی شہرت سو برس سے زیادہ قائم رہی، اس طویل مدت میں اور شاعروں نے بھی مرثیے کہے مگر وہ آذرؔی سے آگے نہ بڑھ سکے، بلکہ اس کے برابر بھی نہ پہنچ سکے اور اس کی سی شہرت حاصل نہ کر سکے۔

تیموری عہد کا ایک اور مرثیہ گو: ابن حسام

ملا حسین واعظ کاشفی نے روضۃ الشہدا میں آذری کے ہم عصر ابن حسام کے ایک مرثیے کے چند شعر نقل کئے ہیں، دولت شاہ نے ابن حسام تخلص کے دو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ دونوں کا نام محمد اور دونوں کے باپ کا نام حسام الدین تھا، دونوں قصیدہ اور منقبت خوب کہتے تھے۔ ایک نے ۷۳۷ھ میں اور ایک نے ۸۷۵ھ میں انتقال کیا۔

پہلے ابن حسان کے تذکرے کے آخر میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں ایک دوسرا ابن حسام بھی ہوا ہے جو قصیدے اور منتخب خوب کہتا تھا اور اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔ دوسرے ابن حسام کے متعلق لکھا ہے کہ وہ نہایت خوشگو تھا، شاعری کے باوجود صاحب فضل تھا، قانع اور تارک دنیا تھا اور دہقانی کر کے حلال کی روٹی کھاتا تھا، بعضوں نے اس کو اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے منقبت گوئی میں اپنے زمانے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔

ابن حسام کے قصیدے:

اس کے قصیدے اعلیٰ درجے کے ہیں (۲) قرینہ کہتا ہے کہ یہی وہ ابن حسام ہے جس کا

(۱) تاریخ عالم آرای عباسی، مطبوعہ طہران ۱۳۱۴ھ، ص ۱۳۰۔

(۲) تذکرہ دولت شاہ، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶، ص ۴۳۸ تا ۴۳۹۔

مرثیہ روضۃ الشہدا میں نقل کیا گیا ہے۔

قاضی نوراللہ شوشتری نے بھی ابن حسام کا ذکر کیا ہے اور دولت شاہ کے بیان پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ابن حسام نے رسول مجتبیٰ کی نعت اور ائمہ ہدیٰ کی منقبت میں بلند پایہ قصیدے کہے ہیں جو ایران کے شہروں میں مشہور اور آل عبا کے محبوں کی زبانوں پر مذکور ہیں، انہوں نے ابن حسام کے چار قصیدے نقل کئے ہیں جن میں سے پہلے قصیدے کے چند شعر دولت شاہ کے تذکرے میں بھی نقل کئے گئے ہیں۔ وہ اس قصیدے میں کہتا ہے:

دین من است منقبت خاندان تو　　　بی دین کسی بود که نیاورد دین بدین

گر نعت اهل بیت تو رفض است رافضم　　　هم آسمان گواست برین قول هم زمین

ایک دوسرے قصیدے میں کہتا ہے:

اشعار من ستائش داماد مصطفیٰؐ ست　　　زین آب بود طینت ما را مخمّری

هذا عقیدتی و طریقی و مذهبی　　　یا رب بر این عقیده ز خاکم برآوری

اسی ابن حسام نے ۸۳۰ھ میں ایک ضخیم رزمیہ مثنوی شاہ نامہ فردوسی کی بحر میں لکھی اور اس میں حضرت علیؑ اور ان کے بعض رفیقوں کی جنگوں کا بیان کیا۔ واقعات فرضی اور تمثیلی ہیں۔ پریوں، دیووں، بھوتوں، شیروں اور اژدہوں سے جنگ کرنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی طرح جادو گروں سے مقابلے، طلسم کشائیاں، عیاریاں وغیرہ بھی اس مثنوی میں ملتی ہیں، امیر حمزہ کے مشہور عیار عمرو بن امیہ اور داستان امیر حمزہ کے مشہور سپاہی معدی کرب۔ سے بھی یہاں ملاقات ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا منظوم ترجمہ دکھنی اردو میں کمال خان رستمی نے ۱۰۵۹ھ میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی شاہنامے کی بحر میں ہے اور بیس ہزار سے زیادہ بیتوں پر مشتمل ہے۔ فارسی مثنوی کا نام ''خاور نامہ'' تھا۔ اس ترجمہ کا نام مترجم نے ''خاور نامہ'' دکھنی رکھا۔ اردو میں یہ پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا ایک عمدہ نسخہ جس میں آٹھ سو سینتیس تصویریں شامل ہیں، لندن میں انڈیا آفس کے کتبخانے میں موجود ہے۔

قرینہ کہتا ہے کہ حسین واعظ نے جن ابن حسام کے مرثیے کے چند شعر نقل کئے ہیں وہ یہی ابن حسام ہے جس نے ۸۷۵ھ میں یعنی تیموری عہد کے اواخر میں انتقال کیا۔ وہ شعر ہیں:

که ریخت سونش الماس ریزه در قدحش　　که زهر گشت از آن آب خوشگوار حسنؑ

در اندرون صد و هفتاد پاره شد جگرش　　همه ز راه گلو ریخت در کنار حسنؑ

به رنگ گونهٔ الماس شد زمرد فام　　مفرح لب یاقوت آب دار حسنؑ

جگر بسوخت شفق را چو لاله ز آتش دل　　ز حسرت جگر خسته و فگار حسنؑ

لبش که مایهٔ تریاق بود شه پُر زهر　　فغان ز تلخی شهد و شکر نثار حسنؑ

ستاره خون بچکاند ز چشم اگر بیند　　جراحت جگر و چشم اشکبار حسنؑ

به باغ عترت پیغمبر از خزان ستم　　بریخت لاله و نسرین ز نو بهار حسنؑ

بنفشه بین سر حسرت نهاده بر زانو
زروی غالیه موی بنفشه وار حسنؑ

امیر تیمور کے پوتے بایقرا ابن عمر شیخ کا پوتا ابوالغازی سلطان حسین میرزا ابن منصور ۸۷۲ھ (۱۴۶۸ء) میں تخت پر بیٹھا۔ اڑتیس برس سلطنت کر کے ستہتر سال کی عمر میں ۹۱۱ھ (۱۵۰۶ء) میں انتقال کیا۔ اس کے ساتھ ایران میں آل تیمور کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، یہ بادشاہ ابتدا میں شیعیت کی طرف مائل تھا، مگر بعد کو اس کے وزیر میر علی شیر نوائی نے اس کا دل ادھر سے ہٹا دیا۔ بہر حال یہ بادشاہ اور وزیر دونوں آل رسول سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ان کے دشمنوں کو قابل لعنت سمجھتے تھے۔ علی شیر نوائی کہتا ہے:

ای که گفتی بر یزید و آل او لعنت مکن　　زان که باشد حق تعالی کرده باشد رحمتش

آنچه با آل نبی کرد او اگر بخشد خدای　　هم بخشاید ترا گر کرده باشی لعنتش

میر علی شیر کے جو آثار ایران میں اب تک موجود ہیں ان میں سے ایک روضہ امام رضا کے صحن کہنہ کا جنوبی ایوان ہے جس پر کاشی اور سونے کا کام کیا ہوا ہے۔ اس نے ایک بڑی جائداد امور خیر

کے لئے وقف کردی تھی اور خرچ کی ایک مد یہ رکھی تھی کہ عاشورے کے دن پچاس من روٹی اور چالیس من گوشت کا سالن تقسیم کیا جایا کرے۔ یہ چیزیں ائمہ سے اس کی عقیدت مندی کا ثبوت ہیں۔

روضۃ الشہدا ء کی تصنیف:

سلطان حسین علوم وفنون اور ادبیات کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ ہرات میں اس کا دربار علم وفن، ادب وشعر کا ایسا مرکز تھا جو اپنی تابناکی میں ایران کے کسی دوسرے دربار سے کم نہ تھا۔(۱) اس کے عہد میں ملا کمال الدین حسین واعظ کاشفی نے شاہزادہ مرشد الدین عبداللہ عرف سید میرزا ابن صلاح الدین موسیٰ کی فرمائش پر مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے کتاب روضۃ الشہدا ء لکھی۔

شاہ زادہ عبداللہ کا تعارف:

شاہزادہ عبداللہ باپ کی طرف سے حسنی سید تھا اور ماں کی طرف سے اس کا سلسلۂ نسب امیر تیمور تک پہنچتا تھا۔ اس کا نانا معزالدین بایقرا ہرات کے بادشاہ ابوالمغازی سلطان حسین کا برادر اعیانی تھا اور خود شہزادہ عبداللہ سلطان حسین کی دامادی کا شرف رکھتا تھا۔(۲) روضۃ الشہدا ء کے آخر میں مصنف نے اس شاہزادے کا لقب، نام اور عرف ایک شعر میں یوں بتایا ہے:

مرشد الدین شاہ عبد اللہ کز حکم ازل   در ممالك مشتهر باشد به سید میرزا(۳)

اور ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ جس طرح مختار بن ابی عبیدہ ثقفی، مسیّب بن نقاع خزاعی، ابراہیم بن اشتر نخعی وغیرہ نے بہت سے یزیدی شامیوں اور کوفیوں کو قتل کیا اور صاحب الدعوۃ ابومسلم مروزی نے مروانیوں کا استقبال کیا اور امیر تیمور نے اہل شام سے انتقام لیا اسی طرح یہ شاہزادہ بھی

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران، جلد سوم، ص ۳۹۰۔

(۲) روضۃ الشہدا ء، ص ۳۸۲۔

(۳) روضۃ الشہدا ء، ص ۳۸۲۔

انتقام لینے اور باقی ماندہ ظالموں کو دفع کرنے میں مصروف ہے۔(۱)

آل تیمور کے عہد میں عزاداری:

روضۃ الشہدا میں جگہ جگہ ایسے بیان ملتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آل تیمور کی حکومت کے زمانے میں ایران میں عشرۂ محرم میں شہدائے کربلا کی عزاداری اور مجالس عزا کا عام رواج تھا اور رسوم عزا بڑی عقیدت کے ساتھ انجام دیئے جاتے تھے۔ متعلقہ عبارتیں اردو خلاصے کے ساتھ ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

جمعی از محبان اهل بیت هر سال که ماه محرم در آید مصیبت شهداء را تازه سازند و به تعزیت اولاد حضرت رسالت پناه ...پردازند. همه را دلها بر آتش حیرت بریان گردد و دیده ها از غایت حسرت گریان شود ... و اخبار مقتل شهدا که در کتب مسطور و مذکور است تکرار نمانید و به آب دیده غبار ملال از صفحهٔ سینه بزدایند''.(۲)

یعنی ہر سال محرم کے مہینے میں اہل بیت کے محب شہیدوں کا غم تازہ کرتے ہیں، آل رسول کا سوگ مناتے ہیں اور شہیدوں کے حالات جو کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں ان کو بیان کر کے روتے ہیں۔

''این دریغ و درد تا قیام قیامت درمیان ماتم زدگان این امت باقی خواهد بود و هر سال که ماه عاشورا در آید مصیبت داران حسین را درد خواهد افزود''.(۳)

یہ درد و غم اس امت کے ماتم داروں میں قیامت تک باقی رہے گا اور ہر سال جب محرم کا مہینہ آئے گا حسینؑ کے سوگواروں کے غم میں اضافے پر اضافہ ہوتا رہے گا۔

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۵۷

(۲) روضۃ الشہدا، ص ۶۔

(۳) روضۃ الشہدا، ص ۹۴۔

"ایام غم انجام عاشورا محل ماتم و بکا ست"(۱) عشرہ محرم کا غم ناک زمانہ گریہ وماتم کا محل ہے۔

"از روز شهادت امام حسین تا تاریخ تالیف این کتاب که هشت صد و چهل و هفت سال است هر گاه که ماه محرم نو شود رقم تجدید این ماتم بر صفحات قلوب اهل اسلام و هواداران اهل بیت سید انام ... کشیده می گردد. و از زبان هاتف غیبی... نسبت با مصیبت داران اهل بیت این ندا شنیده می شود."

کای عزیزان در غم سبط نبی افغان کنید	سینه را از سوز شاه کربلا بریان کنید
از پی آن تشنه لب بر خاك ریزید آب چشم	درمیان گریه یاد آن لب خندان کنید
چون ز خاك و خون او یاد آورید ای دوستان	می سزد گر چون سحاب از دیله خون باران کنید
نخل قدّش را ز جوی دیله ها آبی دهید	اندر آن ساعت که گشت گلشن و بستان کنید
در چمن گر روی گل بینید از شوق رخش	بادل پُر درد همچون بلبلان افغان کنید
گر رسد از سنبل سیراب بویی در مشام	یاد آن جعد سیاه و موی مشك افشان کنید(۲)

امام حسینؑ کی شہادت کے دن سے اس کتاب کی تالیف کی تاریخ تک کہ آٹھ سوسینتالیس سال ہوئے، جب محرم کا نیا مہینہ آتا ہے، تو مسلمانوں اور اہل بیت کے ماننے والوں کے دلوں پر یہ ماتم از سرنو لکھ جاتا ہے اور عزاداران اہل بیتؑ کی نسبت ہاتف غیبی کی یہ ندا سنائی دیتی ہے،" ای عزیزان در غم سبط نبی افغان کنید ...الخ

"عجب روزی که ارواح انبیاو مرسلین و زمرهٔ ملائکه مقربین بر موافقت سید اولین و آخرین از آن واقعه گریان بودند و حوران بهشت ...در مصیبت و غم و تعزیت و الم با بتول عذرا اتفاق نمودند در آن روز علم عشرت نگون سار بود و خیل

---

(۱) روضۃ الشہدا ار ص۸۶۔

(۲) روضۃ الشہدا ار ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

و حشم ، محنت و الم بی شمار ، زمین می نالید که امروز روز عاشور است ، زمان فریاد می زد که روز فتنه و شر و شور است۔''

بیا بگری که عاشور است امروز　جهان تاریك و بی نور است امروز
حسینی کو نبی را نور دیده است　بدست خصم مقهور است امروز
بریده حلق و تشنه لب جگر خون　سر از تن تن ز سر دور است امروز
رخ چون آفتابش ای دریغا　به میغ تیغ مستور است امروز(۱)

روز عاشورا عجب دن ہے کہ انبیاو ملائکہ اس واقعہ سے رسالتمآبؐ کے ساتھ گریاں ہوئے اور حوروں اور جنیوں نے اس مصیبت میں حضرت فاطمہؑ کا ساتھ دیا اس دن عشرت کا علم سرنگوں ہوگیا اور غم والم کا بے شمار مجمع ہوگیا، زمین روئی کہ آج روز عاشورا ہے، زمان نے فریاد کی کہ یہ فتنہ وفساد اور شور وشر کا دن ہے۔
بیابگری که عاشوراست امروز...الخ

''هوادران اهل بیت درین روز از شادی و عشرت کرانه نمایند و درهای اندوه و محنت بر روی دل سوخته بکشانید. زمانی اشك ندم از دیده ببارند و زمانی آه سوزناك از سینه بر آرند''.(۲)

اہلبیت کے ماننے والے عاشورے کے دن عیش وعشرت سے کنارہ کر لیتے ہیں اور غم و اندوہ کے دروازے اپنے دلوں پر کھول دیتے ہیں، کبھی آنکھوں سے آنسو برساتے ہیں اور کبھی سینے سے آہیں کھینچتے ہیں۔

''محنت زدگان آخر الزمان که در ماتم شاه شهیدان بادیدهٔ گریان و سینه بریان حاضر می شوند و داستان حکایات جگر سوز و روایات غم اندوه ز شهدای کربلا می شنوند''(۳)

---

(۱) روضۃ الشہدا ، ص۳۳۶۔
(۲) روضۃ الشہدا ، ص۳۳۶۔　(۳) روضۃ الشہدا ، ص۳۷۶، ۳۷۷۔

آخری زمانے کے غم زدہ لوگ جو سید الشہدا کے ماتم میں روتی ہوئی آنکھوں اور جلتے ہوئے سینوں کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور کربلا کے شہیدوں کی جگر سوز حکایتوں اور غم ناک روایتوں کا بیان سنتے ہیں۔

لایق بود درین دهه از ما گریستن — بر عترت نبی معلّا گریستن
ای دوستان نهان مکشید آهِ سوزناك — کامد زمان نعره و پیدا گریستن
پیران با وقار و جوانان جمع را — لازم بود بر آن شه بُرنا گریستن
عین صفاست مقنعه داماں عهد را — در ماتم خدیجهٔ کبریٰ گریستن
محض وفاست زهره جبینان عصر را — بر فوت نور دیدهٔ زهرآ گریستن
حوران ز بهر فاطمهؓ آغاز کرده اند — بر غرفه های جنت ماوا گریستن
مادر نه بود و جدّ و پدر روز ماتمش — باید بجائی این همه ما را گریستن
بی ناله و خروش نباشید یك نفس — قانع چرا شوید به تنها گرستن(۱)

روضۃ الشہدا کا سال تصنیف:

روضۃ الشہدا کا سال تصنیف تو مصنف نے نہیں بتایا ہے۔ لیکن دیباچے میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے اور ایک جگہ ضمنی طور پر یہ لکھا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے دن سے اس کتاب کی تالیف کی تاریخ تک آٹھ سو سینتالیس (۸۴۷) برس گزر چکے ہیں۔(۲) واقعہ کربلا ۶۱ھ میں ہوا تھا۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حسین واعظ نے یہ کتاب ۹۰۸ھ (۱۵۰۳ء) میں اپنے انتقال سے صرف دو ڈیڑھ سال پہلے لکھی تھی۔ اس کی تالیف کو ساڑھے چار سو برس ہو چکے ہیں۔ لیکن آج بھی یہ کتاب پڑھی جاتی ہے۔ اس طویل مدت میں اس موضوع پر اسی طرز کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن وہ نہ اتنی مقبول ہو سکیں نہ بہت دن زندہ رہ سکیں۔

---

(۱) روضۃ الشہدا ار، ص ۴۴۔ (۲) روضۃ الشہدا ا، ص ۳۳۵۔

کیا روضۃ الشہدا فارسی میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے؟:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روضۃ الشہدا فارسی میں مقاتل و مصائب کی پہلی کتاب ہے۔ لیکن مصنف روضۃ الشہدا کے بعض بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس کتاب سے پہلے متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی تھیں۔ ابوالمفاخر اور نورالائمہ کے فارسی مقتلوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ روضۃ الشہدا میں ان مقتلوں سے روایتیں لی گئی ہیں اور نظمیں نقل کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ روضۃ الشہدا کی تصنیف کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے:

"ھر کتابی که درین باب نوشته اند اگرچه بزیور حکایت شهدا حالی است اما از سمت جامعیت فضائل سبطین و تفاصیل احوال ایشان خالی است ـ بدین جهت اشارت عالی از عالی حضرت ... شاهزادهٔ اعظم ...مرشد الدولة و الملة و الدین عبد الله المشتهر به سید میرزا ...شرف صدور یافت که این فقیر حقیر ... بتالیف نسخهٔ جامع ... اشتغال نماید و از ابیات عربی آنچه ضروری الذکر باشد مع ترجمه ایراد کند و از منظومات فارسی آنچه مناسب اذهان اهل زمان بود برشتهٔ بیان کشد.(۱)

یعنی ہر کتاب جو اس بارے میں لکھی گئی ہے اس میں شہیدوں کے حالات تو ہیں مگر سبطین کے فضائل اور ان کے حالات کی تفصیل کے اعتبار سے ان میں جامعیت کی صفت نہیں ہے۔ اس وجہ سے شاہزادہ مرشد الدین عبداللہ معروف بہ سید میرزا نے مجھ سے ایک جامع کتاب لکھنے کی فرمائش کی اور یہ ہدایت کی کہ عربی کے صرف وہ شعر جن کا ذکر ضروری ہو مع ترجمے کے لائے جائیں اور فارسی کی ایسی نظمیں شامل کی جائیں جو اس زمانے والوں کے ذہن سے مناسبت رکھتی ہوں۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ روضۃ الشہدا سے پہلے کئی کتابیں واقعات کربلا کے بیان میں لکھی جا چکی تھیں اور وہ فارسی میں تھیں، کیونکہ اگر وہ عربی میں ہوتیں تو ان کا جامع اور مفصل نہ ہونا نئی

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۶، ۷۔

کتاب کی تصنیف کا خاص سبب نہ قرار پاتا بلکہ ان کا عربی میں ہونا، جس کی وجہ سے وہ اہل ایران کے لئے عام فہم نہ ہو سکتی تھیں۔

اشعار اور منظومات کے بارے میں شاہزادہ عبداللہ نے مصنف کتاب کو دو ہدایتیں کی ہیں ایک یہ کہ عربی کے صرف وہ شعر لکھے جائیں جن کا ذکر ضروری ہو اور ان کا فارسی میں ترجمہ کر دیا جائے، دوسری یہ کہ فارسی کی ایسی نظمیں کتاب میں شامل کی جائیں جو عام فہم ہوں۔ ان ہدایتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مجالس عزا میں عوام بھی شریک ہوتے تھے، جو صرف اپنی مادری زبان فارسی کو سمجھ سکتے تھے، عربی سے واقف نہ تھے۔ اس خیال کی تائید مصنف کے حسب ذیل بیانوں سے بھی ہوتی ہے:

"در مبداء تالیف این اوراق مقرر شده که متصدی ایراد ابیات عربی نگردد مگر آنچه ذکر آن ضرورت بود چه استماع آن در اثناء اخبار پارسی زبانان را سبب توزع ضمیر می باشد"(۱)

یعنی ان اوراق کی تالیف کی ابتدا میں یہ طے ہو چکا ہے کہ عربی کے شعر شامل نہ کئے جائیں سوائے ان کے جن کا ذکر ضروری ہو کیونکہ شہیدوں کے حالات کے درمیان میں عربی اشعار سننا فارسی زبان والوں کے لئے انتشار خاطر کا سبب ہوتا ہے۔

"رجز هر مبارزی را که می خوانده چون پارسی زبانان را از آن فائده نیست و سررشته سخن بسبب آن انقطاع می یابد اینجا نیاورد مگر آنهائی که ضرورت باشد". (۲)

یعنی ہر مجاہد نے جو رجز پڑھا وہ میں نے نہیں لکھا سوائے ان کے جن کی ضرورت تھی، کیونکہ اس سے فارسی زبان والوں کو کچھ فائدہ نہیں ہے اور اس کے سبب سے کلام کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مصنف روضۃ الشہدا کا یہ قول قابل غور ہے:

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۲۴۴۔ (۲) روضۃ الشہدا، ص ۲۶۵۔

”اشعاری کہ ترجمان رجزھا بود از گفتار قدما و مناسب اذھان لطیفۂ اھل زمان نمی نمود آن نیز مطوی شد“(۱)

یعنی رجزوں کے ترجمے کے وہ اشعار بھی چھوڑ دیئے گئے ہیں جو گفتار قدما سے ہیں اور اس زمانے والوں کے ذہن سے مناسبت نہیں رکھتے۔اس سے ظاہر ہے کہ روضۃ الشہدا کی تصنیف کے وقت مجاہدین کربلا کے رجزوں کا فارسی ترجمہ موجود تھا جو بہت قدیم شاعروں نے کیا تھا، جن کی قدیم زبان اس وقت کے لوگوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور ان کو پسند نہ تھی۔ اسی بنا پر رجزوں کے وہ ترجمے روضۃ الشہدا میں درج نہیں کئے گئے۔ لیکن ابوالمفاخر اور نورالائمہ کے مقتلوں سے متعدد رجزوں کے فارسی منظوم ترجمے اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ان دونوں کے کلام کو گفتار قدما میں شمار نہیں کرتا اور اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اشعار رجز کے جو ترجمے اس نے چھوڑ دیئے ہیں وہ ایسے شاعروں کے کہے ہوئے ہیں، جو ابوالمفاخر اور نورالائمہ سے بہت پہلے گزرے ہیں اور ان کی زبان لوگوں کے لئے غیر مانوس ہوگئی تھی اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جن قدیم شاعروں نے اشعار رجز کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، انہوں نے واقعات کربلا فارسی میں لکھے ہوں گے۔ ورنہ فقط رجزوں کا ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ تو یقینی ہے کہ روضۃ الشہدا سے پہلے واقعات کربلا کے بیان میں فارسی زبان میں کتابیں لکھی جا چکی تھیں، لیکن اس کتاب نے اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی کہ اس سے پہلے کی کتابوں کو لوگ بھول گئے۔اس کا خاص سبب خود مصنف کی زبان سے سنیئے:

”در اغلب رسائل کہ سخنان این مقتل مرقوم شدہ تفصیل این مبارزان و کیفیت مبارزت ایشان مذکور نیست و بمجرد نامہ و شعری اکتفا کردہ اند و این کمینہ تفحص و تصفح بسیار کردہ تفاصیل آن واقعہ را بطریقۂ خیر الکلام درین اوراق ایراد نمود“.(۲)

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۲۶۵۔ (۲) روضۃ الشہدا، ص ۲۶۵۔

یعنی بیشتر رسالے جن میں اس مقتل کا حال لکھا گیا ہے ان میں ان مجاہدوں کی تفصیل اور ان کے جہاد کی کیفیت نہیں بیان کی گئی ہے اور کسی کا صرف نام اور کوئی شعر لکھ دیا گیا ہے۔ اور میں نے بڑی تلاش اور چھان بین کر کے واقعہ کربلا کے تفصیلات اچھے طریقے سے اس کتاب میں پیش کر دیئے ہیں۔ یہی تفصیل اور جامعیت روضۃ الشہدا کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے لوگوں کو اور سب کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔

روضۃ الشہدا ر کے ابتدائی کئی بابوں میں انبیاء اور ائمہ کے فضائل و مصائب بیان کئے گئے ہیں مگر ان کے ساتھ واقعات کربلا اور مصائب امام حسینؑ کو ربط دے دیا گیا ہے، اس لئے کہ بقول مصنف:

''مقصد اصلی از تالیف این کتاب ذکر احوال شهدای اهل بیت است''.(۱)

یعنی شہدائے اہل بیت کے حالات کا بیان اس کتاب کی تالیف کا اصلی مقصد ہے۔

شاہزادہ عبداللہ نے مصنف روضۃ الشہدا کو ہدایت کی تھی کہ عربی کے صرف وہ شعر کتاب میں درج کئے جائیں جن کا ذکر ضروری ہو اور ان کا فارسی میں ترجمہ بھی کر دیا جائے لیکن اس نے بعض مقامات پر عربی اشعار کا صرف فارسی ترجمہ درج کر دیا ہے مثال میں ایک ایسا مقام پیش کیا جاتا ہے۔ مدینے سے کربلا جاتے ہوئے ایک منزل پر امام حسینؑ سے کوفے کے ایک نامی شخص عبیداللہ جعفی سے ملاقات ہوئی اور آپ نے اس سے مدد چاہی تو وہ اپنی جان کے خوف سے نصرت پر آمادہ نہ ہوا۔ لیکن امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اس نے اپنے اس قصور پر ندامت اور افسوس کا اظہار چند عربی شعروں میں کیا، جو ابوالموئید موفق بن احمد مکی کی تاریخ میں مندرج ہیں۔ (۲) روضۃ الشہدا میں ان اشعار کا صرف فارسی ترجمہ درج کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے:

---

(۱) روضۃ الشہدا،ص ۱۴۵۔

(۲) روضۃ الشہدا،ص ۲۴۳،۲۴۴۔

زهی حسرت که چون شاه شهیدان — مرا گفتا قدم درنهه به یاری
چرا همراه آن حضرت نه رفتم — نه ورزیدم طریق حق گذاری
اگر در کربلا می گشتم آن روز — شهید راه او در دوست داری
بسی بودی به فردای قیامت — مرا از لطف او امیدواری
کنون او رفت و من از روی تقصیر — بمانده در مقام شرم ساری
بصد زاری دما دم می کشم آه — ولی سودی ندارد آه و زاری (۱)

روضۃ الشہدا کے مضامین:

روضۃ الشہدا میں دیباچے اور خاتمے کو چھوڑ کر دس باب ہیں، دیباچے میں خاصان خدا کے مصائب اور عزائے حسینؑ کے ثواب کا ذکر کرنے کے بعد کتاب کا سبب تالیف بیان کیا ہے۔ خاتمۂ کتاب میں حسنینؑ کی اولاد اور ان کے سلسلۂ نسب کا بیان ہے۔ اصل کتاب میں جو دس باب ہیں ان کے مضامین کی فہرست یہ ہے۔

باب اول: بعض انبیا کی مصیبتیں
باب دوم: رسالتمآبؐ پر قریش کی جفائیں، حضرت حمزہ اور حضرت جعفر طیار کی شہادت
باب سوم: سید المرسلینؐ کی وفات
باب چہارم: حضرت فاطمہؑ کے حالات
باب پنجم: حضرت علیؑ کے حالات
باب ششم: امام حسنؑ کے حالات
باب ہفتم: امام حسینؑ کے حالات ولادت سے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد تک

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۲۲۵۔

باب ہشتم: حضرت مسلم اور ان کے فرزندوں کی شہادت

باب نہم: امام حسینؑ کا کربلا میں ورود، اعدا سے جنگ اور اعزا اور انصار کے ساتھ شہادت

باب دہم: امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اہل بیت کے واقعات اور دشمنوں کے حالات

باب دہم کے خاتمے پر مصنف دعا کرتا ہے ان محنت زدگان آخر الزمان کے لئے ''که در ماتم شاه شهیدان بادیدهٔ گریان و سینه بریان حاضر می شوند و داستان حکایات جگر سوز و روایات غم اندوز شهدای کربلا می شنوند''۔(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عزا کی مجلسیں برپا ہوتی تھیں اور واقعات کربلا کا بیان سن کر لوگ گریہ کرتے تھے۔ روضۃ الشہدا انہیں مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی، اس لئے دس بابوں میں تقسیم کی گئی ہے کہ عشرۂ محرم میں روزانہ ایک ایک باب پڑھا جا سکے۔ روضۃ الشہدا کی تقلید میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر دس مجلسوں پر مشتمل تھیں اور اس لئے وہ مجلس کہلاتی تھیں، یہ اصطلاح اس قدر عام ہوگئی کہ بعد کو جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں اور جن میں مجلسوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی وہ بھی وہ مجلس ہی کہلائیں۔

روضہ خوان:

اوپر کہا جا چکا ہے کہ روضۃ الشہدا کی عام مقبولیت نے اس موضوع کی اور کتابوں کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ ایک مدت تک یہی کتاب مجالس عزا کی زینت رہی، اس کو پڑھنے کے لئے مخصوص پر اثر طرز ایجاد کئے گئے، بعض لوگوں نے اس کو پڑھنے کی خاص مہارت پیدا کرلی یا اس کا پڑھنا اپنا پیشہ بنالیا۔ یہ لوگ روضہ خوان کہلاتے تھے۔ روضۃ الشہدا کی تصنیف کے پونے دو سو برس بعد طاہر نصر آبادی اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتا ہے کہ کاظما جو اصلاً تبریزی ہے مگر نشو و نما کاشان میں پائی تھی اور وہیں معلمی کرتا تھا۔ ایام عاشورا میں جب وہ روضۃ الشہدا پڑھتا ہے تو مجلس میں ایک شور ہو جاتا ہے۔(۲) روضہ

---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۷۶، ۳۷۷۔

(۲) تذکرہ طاہر نصر آبادی مطبوعہ تہران، ص ۲۷۱۔

الشہدا کی مقبولیت کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے انداز میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ وہ بھی مجالس عزا میں پڑھی جاتی تھیں اور ان کے پڑھنے والے بھی روضہ خوان ہی کہلاتے تھے، بعد کو مجالس عزا میں واقعات کربلا بیان کرنے والے سبھی روضہ خوان کہلانے لگے۔

روضۃ الشہدا میں مرثیے:

روضۃ الشہدا نثر میں لکھی گئی ہے مگر اس میں چھوٹی چھوٹی سیکڑوں نظمیں شامل ہیں۔ ان میں کچھ دوسروں کی کہی ہوئی ہیں اور کچھ خود مصنف نے لکھی ہوں گی۔ لیکن کسی نظم میں کاشفی کا تخلص نہیں ملتا ہے۔ ان نظموں میں بہت سی ایسی ہیں جن کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ چند نظمیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

در جهان زین صعب تر هر گز بلائی کس نديد　　دل شکن تر زین عزا هر گز عزائی کس ندید
تا ز بی آبی گل باغ نبیؐ پژمرده شد　　در سرا بستان دین برگ و نوائی کس ندید
چشم گردون چون نه گرید چون که در دوران او　　چون بلای کربلا کرب و بلائی کس ندید
در سرایی دهر تا شد رسم ماتم آشکار　　هم چو دشت کربلا ماتم سرائی کس ندید(۱)



آه این چه حالت است که عالم خراب شد　　بحر زلال آل محمدؐ سراب شد
سروی زبوستان ولایت ز پا فتاد　　برجی ز آسمان هدایت خراب شد
چون ذره بی قرار از آنم که کربلا　　بیت الوبال کوکبهٔ آفتاب شد
از یاد کربلا دل ما بی قرار گشت　　و ز داغ ابتلا جگر ما کباب شد
روئی چنان که بوسه گهه مصطفی بُدی　　در خاك شد فتاده و از خون خضاب شد(۲)



(۱) روضۃ الشہدا، ص ۱۵۔

(۲) روضۃ الشہدا، ص ۱۸۔

لائق بود درین دهه از ما گریستن　　بر عترت نبی معلیٰ گریستن
ای دوستان نهان مکشید آه سوزناك　　کامد زمان نعره و پیدا گریستن
پیران باوقار و جوانان جمع را　　لازم بود بر آن شه بُرنا گریستن
عین صفاست مقنعه داران عهد را　　در ماتم خدیجهؑ کبریٰ گریستن
محض وفاست زهره جبینان عصر را　　بر فوت نور دیدهٔ زهراؑ گریستن
حوران زبهر فاطمهؑ آغاز کرده اند　　بر غرفه های جنت ماویٰ گریستن
مادر نه بود و جدّ و پدر روز ماتمش　　باید بجایی این همه ما را گریستن
بی ناله و خروش مباشید یك نفس　　قانع چرا شوید به تنها گریستن(۱)



اندرین ماتم ملائك دم بدم بگریسته　　جن و انس و علوی و سفلی زغم بگریسته
کرسی از جا رفته و سدره در افتاده ز پای　　عرش نالان گشته و لوح و قلم بگریسته
مهر عالم تاب باسوز جگر نالیده زار　　پیر گردون هر زمان باپشت خم بگریسته
زین عزا بهر رضای خواجهٔ رکن و مقام　　ناله کرده زمزم و بیت الحرم بگریسته
حور عین بهر رضای فاطمهؑ در باغ خلد　　بر شهید بادیه با صد الم بگریسته(۲)



ای زهجرانت زمین و آسمان بگریسته　　سینه و دل خون شده روح و روان بگریسته
کن فکان چون قلب اند و تو چو جانی لا جرم　　در عزای تو تمامی کن فکان بگریسته
نی همیں ما خاکیان بهر تو ماتم داشتیم　　بلکه رضوان نیز در باغ جنان بگریسته

---

(۱) روضۃ الشہداء ،ص ۴۴۔

(۲) روضۃ الشہداء ،ص ۸۰۔

چون گری ای دیدہ بهر سیّدی کزماتمش — جبرئیل اندر فلك با قدسیان بگریسته

آدم و نوح و خلیل و موسی و عیسیٰ بهم — در عزای سیّد آخر زمان بگریسته

اهل بیت آن دم که گریان گشته از بهر رسول — سنگ خارا بر دل پُر دردشان بگریسته(۱)



هر که امروز از برای آن شهیدان غم کند — باشد از اندازه بیرون شادی فردای او

ای عزیزان یك ره از حال حسنؑ یاد آورید — گشته تلخ از زهر دشمن لعل شکرخامی او

پس بر اندیشید از قتل حسین ابن علیؑ — و ز غم اولاد پاك و عترت والای او

تشنه لب، خسته جگر، مجروح تن، پُر غصه دل — درمیان خاك و خون پنهان رخ زیبای او(۲)



گربه قدر سوزش دل چشم من بگریستی — مرغ و ماهی در غم من تن به تن بگریستی

حال یاقوت لبش کز زهر شد زنگار خام — گر بدانستی عقیق اندر یمن بگریستی

لعل اگر آن خردهٔ الماس دیدی برلبش — خون شدی و زسوز آن فخر زمن بگریستی

زان جگر کو پاره پاره گشت اگر آگه شدی — مرغ زاری کردی و بربا بزن بگریستی(۳)



واحسرتا که سرو روان از چمن برفت — یعنی که نور دیدهٔ زهراؑ حسنؑ برفت

از شوق گیسویش جگر نافه گشت خون — و ز هجر رویش آب رخ نسترن برفت

یعقوب وار دیدهٔ نرگس سفید شد — کز مصر ناز یوسف گل پیرهن برفت(٤)

---

(۱) روضۃ الشہداء، ص ۱۰۵۔

(۲) روضۃ الشہداء، ص ۱۵۴۔

(۳) روضۃ الشہداء، ص ۱۷۱۔

(۴) روضۃ الشہداء، ص ۱۷۹۔

آدم درین عزا به غم و غصه مبتلاست — کشتی نوح غرقهٔ طوفان ابتلاست
هان ای خلیل آتش نمرود دیدهٔ — این شعله بین که در جگر شاه کربلاست
رنگین چراست پیرهن موسوی ز نیل — و زدست غصه جُبّهٔ عیسیٰ چرا قباست
گویا برای ماتم سلطان دین حسینؑ — چندین خروش و ولوله در خیل انبیاست
این غم از برای دل مصطفیٰؐ خورند — آن خود چه حسرت است که در جان مصطفیٰؐ ست
گر مرتضیٰ بگرید ازین غصه در خوراست — ور فاطمه بنالد از این حالها رواست
شورش نه بر زمین بود و بس که بر فلك — درهر که بنگری به همین داغ مبتلاست(۱)

☆☆☆☆☆

خاك را کز خون آن شهزاده رنگین کرده اند — جمله حوران سرمهٔ چشم جهان بین کرداه اند
کوه خارا سنگ ها برسرزند گربشنود — آنچه آن سنگین دلان باآل یسین کرده اند
وه چرا بر خاك میدان غرق خون افتاده اند — شه سوارانی که فتح قلعهٔ دین کرده اند(۲)

☆☆☆☆☆

حضرت علی اکبر کا مرثیہ امام حسینؑ کی زبان سے:

ای عزیز پدر کجا رفتی — و ز کنار پدر چرا رفتی
برنخورده ز بوستان حیات — سوی کاشانهٔ فنا رفتی
نه کزین کلبهٔ فنا رستی — برسرا پردهٔ بقا رفتی
مصطفیٰؐ جدّ تست می دانم — که به نزدیك مصطفیٰؐ رفتی
فرع زهراؑ و مرتضیٰؑ بودی — سوی زهراؑ و مرتضیٰؑ رفتی(۳)

☆☆☆☆☆

---

(۱) روضۃ الشہدا،ص ۲۳۴۔

(۲) روضۃ الشہدا،ص ۲۳۹۔

(۳) روضۃ الشہدا،ص ۳۲۳۔

ای دریغا دیدۂ انصاف گربینا بُدی
سبطِ پیغمبر چرا در کربلا تنها بُدی

بر غریبی حسینؑ و درد او بگریستی
حضرت ختم النبیینؐ گر در آن صحرا بُدی

کی توانستی کشیدن تیغ در رویش کسی
گر علی مرتضیؑ با ذوالفقار آن جا بُدی

فاطمہؑ از حسرت و اندوہ آن لب تشنگان
جامہ برتن چاك کردی گر در آن غوغا بُدی

گر حسنؑ بودی در آن صحرای پُر کرب و بلا
از غم و سوز برادر والہ و شیدا بدی(۱)



اندرین غم نی همین ارض و سما بگریستند
کاهل عالم از ثریا تا ثریٰ بگریستند

آفتاب و ماہ و عرش و کرسی و لوح و قلم
در غم شاہ شهید کربلا بگریستند

در هوای آن لب محروم از آب فرات
ماهی اندر آب و مرغان در هوا بگریستند

اولیا گشتند بهر مرتضیؑ زاری کنان
انبیا بر اتفاق مصطفیٰؐ بگریستند

در قصور جنت الفردوس حوران سر بسر
از برای خاطر خیر النساؑ بگریستند(۲)



گر بہ نسبت ابر نیسان هم چو من بگریستی
چشم پروین بر سحاب قطرہ زن بگریستی

زهرہ کو تا زهر جام دشمن آوردی بیاد
و ز سر حسرت چو زهراؑ بر حسنؑ بگریستی

کاشکہ صد دیدہ بودی مردم چشم مرا
تا بہ صد دیدہ بر آن فخر زمن بگریستی

رشتۂ موی حسینؑ آغشتہ شد در خاك و خون
چشم شب کو تا بر آن مشکین رسن بگریستی

یوسف مصر نبی را جامہ پر خون شد کجاست
دیدۂ یعقوب تا بر پیرهن بگریستی

کوہ را گر گوش بودی تا شنیدی نالہ اش
با همہ سنگین دلی کوہ از حزن بگریستی

طفل خُرد شهربانو تشنہ لب شد آب کو
تا بر آن لب تشنۂ شیرین دهن بگریستی(۳)



---

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۲۶۔

(۲) روضۃ الشہدا، ص ۳۲۴۔

(۳) روضۃ الشہدا، ص ۳۵۴۔

شہدائے کربلا کا مرثیہ حضرت ام کلثوم کی زبان سے:

فریاد کہ بی مونس و غم خوار بماندیم رفتند عزیزان و زغم خوار بماندیم

آزاد شدند از غم این وامگہ و ما در مهلکۂ فتنہ گرفتار بماندیم

افگار شد از غم دل ایشان و برفتند ما نالہ کنان بادل افگار بماندیم

در خاك بخفتند و رخ از ما بہ نهفتند افسوس کہ در حسرت دیدار بماندیم

عیسی نفسی بود طبیب همہ دلها بگذشت و همہ بادل بیمار بماندیم(۱)



روضۃ الشہداء میں ایسے قطعے اور رباعیاں بہت ہیں جن میں مرثیت کی شان پائی جاتی ہے مثلاً:

تا دهر هست واقعہ زین صعب تر ندید هر کس خبر شنید کسش باخبر ندید

چشم زمانہ بر ورق چرخ قصہ ای پُر سوز تر ز حال شبیر و شبر ندید(۲)



بر قتل حسین ارض و سما می گریند از عرش علا تا بہ ثری می گریند

ماهی در آب و مرغ در روی هوا در ماتم شاہ کربلا می گریند(۳)



ان مرثیوں کی تصنیف کو آج (محرم ۱۳۸۴ھ میں) ہجری سن کے حساب سے پونے پانچ سو برس ہو چکے ہیں۔اس لئے فارسی مرثیے کی تاریخ میں ان کی اہمیت ظاہر ہے۔

روضۃ الشہداء میں امام حسینؑ کے بیشتر اعزہ وانصار کی زبان سے رجز کے دو دو چار چار شعر پیش

---

(۱) روضۃ الشہداء،ص ۳۶۸۔

(۲) روضۃ الشہداء،ص ۵۔

(۳) روضۃ الشہداء،ص ۵۔

کئے گئے ہیں۔ سب سے طولانی رجز امام حسینؑ کا ہے جو دس شعروں پر مشتمل ہے اور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

جد من خیر الوریٰ فاضل ترین انبیاست   آفتاب اوج عزت شمع جمع اصفیاست

منقبت هاي پدر گر برشمارم دور نیست   دُرِّ دُرج لا فتا و بدرِ بُرج هل اتاست

مادرم خیر النسا فرزند خاص مصطفیٰؐ   بر کمال او کلام بضعة مِنّی گواست

و ز برادر گر به پُرسی هست شاه دین حسنؑ   آن که سبط مصطفیٰؐ و نور چشم مرتضیٰؑ است

هست عمّم جعفر طیار کاندر باغ خُلد   دائما پرواز او تا آستان کبریاست

حمزه سر خیل شهیدان باشدم عمّ پدر   این چنین اصل و نسب در جمله عالم کراست

ای ستمگاران سنگین دل که اخلاق شما   بی وفائی و نفاق و حیله و جور و جفاست

جمله فرزندان و خویشان و عزیزان مرا   قتل کردید این چه آئین است و این طغیان چراست

وین زمان بهر هلاك من کمر بر بسته اید   کشتن من در چه آئین مذهب و ملت رواست

تشنه لب رفتند یاران و من از پی می روم   در قیامت حضرت حق حاکم ما و شماست(۱)



ایران کے عزائی یا رثائی ادبیات میں روضۃ الشہدا کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ عزاداری کے فروغ اور مجالس عزا کی رونق میں اس کے مصنف کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کا شمار مرثیہ گویوں میں نہیں کیا جاتا، مگر اس کی یہ کتاب کئی صدیوں تک مرثیہ گوئی کے لئے مواد بہم پہنچاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس کتاب کی سیکڑوں نظموں میں کچھ مصنف کی کہی ہوئی بھی ضرور ہوں گی، ان وجوہ سے فارسی مرثیے کی تاریخ اس کے حالات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

(۱) روضۃ الشہدا، ص ۳۲۷۔

روضۃ الشہداء کا مصنف:

روضۃ الشہداء کے مصنف مولانا کمال الدین حسین بن علی بقول مصنف روضات الجنات (۱) علوم دینیہ کے جامع، معارف یقینیہ کے عارف اور تفسیر و حدیث کے علم عالم تھے اور بقول مصنف حبیب السیر (۲) علم نجوم وانشا میں اپنے زمانے میں بے مثل تھے اور باقی کل علموں میں اپنے کسی ہم عصر سے کم نہ تھے، خوش آواز شخص تھے، دلکش لہجے میں وعظ کہتے تھے اور مناسب اور نادر عبارتوں میں کلام الٰہی کے معانی اور احادیث کے اسرار وغوامض حل کرتے تھے۔ ملا حسین پہلے سبزوار کی جامع مسجد میں وعظ کہا کرتے تھے پھر سلطان حسین میرزا کی قدرشناسی انہیں ہرات کھینچ لے گئی۔ وہاں وہ ہر جمعہ کو دارالسیادت سلطانی میں وعظ کہتے اور مسجد میر علی شیر میں نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر منگل کو شاہی مدرسے میں اور ہر بدھ کو خواجہ ابوالولید احمد کے مزار پر وعظ کرتے تھے۔ آخر عمر میں کبھی کبھی سلطان احمد میرزا کے عبادت خانے میں بھی وعظ کہتے تھے۔ انھوں نے ۹۱۰ھ (۱۵۰۵ء) میں انتقال کیا۔

مجالس النفائس (۳) مترجمہ حکیم شاہ محمد قزوینی میں ہے کہ مولانا حسین واعظ "جمیع اصناف علوم" کے ماہر ہیں اور علم نجوم میں خصوصاً "فرید دہر" و "وحید عصر" ہیں۔ ان کی کتابیں اور علم اخلاق میں ان کی تصنیفیں "مشہور و بے نظیر" اور "مرغوب صغیر و کبیر" ہیں۔ ان کی جواہر التفسیر نکات و فوائد کا

---

(۱) روضات الجنات فی تاریخ مدینۃ ہرات مصنفہ معین الدین محمد اسفزاری۔ سلطان حسین میرزا کے لئے ۸۷۵ھ میں لکھی گئی۔

(۲) حبیب السیر مصنفہ خواندمیر ۹۲۹ھ میں لکھی گئی۔ مصنف میر علی شیر کی سرکار سے وابستہ تھا۔

(۳) مجالس النفائس نویں صدی ہجری کے شاعروں کا تذکرہ ہے، اس کا مصنف سلطان حسین میرزا کا وزیر میر علی شیر نوائی (متوفی ۹۰۶ھ) بڑا ذی علم اور علم و ادب کا سرپرست تھا، ترکی کا زبردست ادیب اور شاعر تھا۔ یہ کتاب بھی اس نے ترکی میں ۸۹۶ھ میں لکھی تھی۔ اس کا ایک ترجمہ فارسی میں فخری ہراتی نے لطائف نامہ کے نام سے ۹۲۰ھ میں کیا۔ دوسرا فارسی ترجمہ محمد بن مبارک قزوینی معروف بہ حکیم شاہ محمد نے ۹۲۹ھ میں کیا۔ ان دونوں ترجموں کا مجموعہ پروفیسر علی اصغر حکمت نے تہران میں ۱۳۲۳ھ ش میں شائع کیا۔

مجموعہ اور جواہر فوائد کا معدن ہے۔ ان کا سا واعظ دنیا میں نہ کبھی ہوا ہے نہ ہے۔ ان کا وعظ کتنی ہی وسیع اور کشادہ جگہ میں ہو بہت سے لوگ شرکت سے محروم رہ جاتے ہیں اور مجمع کی زیادتی سے بعض لوگوں کے ہلاک ہو جانے کا خوف رہتا ہے۔ آواز حد کی شیریں اور ان کی عبارت انتہا کی لطیف ہوتی ہے۔ امت محمدی میں لحن داودی کا کمال اگر کسی کو ملا ہے تو وہ بس انہی کی ذات ہے۔ ملا حسین واعظ تو تھے ہی شاعر بھی تھے اور کاشفی تخلص کرتے تھے۔ اسی بنا پر وہ ملا حسین واعظ کاشفی کے نام سے مشہور ہیں۔ مجالس النفائس میں ان کا یہ مطلع نقل کیا گیا ہے:

سبز خطا ما زمشك تر غاليه بر سمن مزن　　سنبل تاب داده را بر گل و نستر مزن

حسین واعظ کا مذہب:

روضۃ الشہدا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا حسین واعظ مذہباً اہل سنت تھے مگر حضرت علیؑ سے اتنی عقیدت اور اہل بیت سے اتنی محبت رکھتے تھے، عزاداری کے اتنے طرفدار تھے اور اس کی تبلیغ میں اس قدر کوشاں تھے کہ ان پر شیعہ ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ سبزوار کے رہنے والے تھے جہاں کے باشندے بالعموم شیعہ تھے، مجالس النفائس کا مترجم حکیم شاہ محمد لکھتا ہے:

”مولانا سبزواری است و لیکن از رفض ایشان عاری است و از مذهب باطل ایشان بری، ولیکن از تهمت بری نیست“.(۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں بھی بعض لوگ ان کو شیعہ سمجھتے تھے۔ وہ حضرت علیؑ سے کینہ رکھنے والوں کے نسب میں عیب نکالتے ہیں اور امام حسینؑ کے قاتل کو دوزخی سمجھتے ہیں جیسا کہ ذیل کے دو قطعوں سے ظاہر ہوگا:

هر کرا هست با علیؑ کینه　　در سخن حاجتِ درازی نیست
نیست در دستش آستین پدر　　دامن مادرش نمازی نیست(۲)

---

(۱) مجالس النفائس مطبوعہ تہران، ۱۳۲۳ھ، ص ۲۶۸۔

(۲) روضۃ الشہدا، ص ۸۷۔

روز جزا کُشندۀ فرزند مصطفیٰؑ　　بی شبهه لائق درکات جهنم است

بس کوردل کسی که کند قصد سروری　　کو نور چشم سید اولاد آدم است (۱)

وہ قاتلان امام حسینؑ کی اولاد اور اہل قبیلہ سے انتقام لینے کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور اپنے اس خیال کی تائید میں ایک حدیث اس مضمون کی پیش کرتے ہیں کہ امام عصر قاتلان حسینؑ کو قتل کریں گے اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خون حسینؑ کا انتقام ظہور حضرت مہدیؑ تک باقی ہے۔(۲)

روضۃ الشہدا میں لفظ شیعہ اور اس کا مفہوم:

ملا حسین واعظ نے روضۃ الشہدا میں لفظ شیعہ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ چند مقامات، مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ایک دن مدینہ میں علی بن بشیر ہمدانی نے امام حسنؑ سے کہا کہ آپ کو والی شام سے صلح نہ کرنا چاہئے تھی، آپ نے جواب میں فرمایا:"به یقین دانستم که اگر صلح نه کنم جمیع شیعۀ من در معرض تلف آیند"۔(۳)

۲۔حضرت مسلم کوفہ میں ہانی کے مکان میں مقیم ہیں"چون شیعه را خبر شد که مسلم کجاست گروه گروه نزد او می آمدند"۔(۴)

۳۔ابن زیاد کوفہ پہنچ کر اپنے غلام معقل سے کہتا ہے:برو و با شیعۀ علیؑ اختلاف کن (۵)

۴۔معقل نے کوفہ کی بڑی مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے ہے، نماز بہت پڑھتا ہے اور بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ۔ اس نے دل میں کہا:شیعه جامۀ سفید پاک می پوشند و در نماز اکثار می کنند ، غالب آن هست که این شخص از آن طائفه باشد.(۶)

---

(۱) روضۃ الشہدا،ص ۱۹۰۔　　(۲) ایضا،ص ۵۷۔

(۳) ایضا،ص ۱۶۸۔　　(۴) ایضا،ص ۲۰۹۔

(۵) ایضا،ص ۲۰۰۔　　(۶) ایضا،ص ۲۰۰۔

۵۔ معقل ہانی کے مکان میں حضرت مسلم کے پاس پہنچ گیا اور "بر کماھی احوال شیعہ اطلاع پیدا کردہ از آن جا بیرون آمد"(۱)

۶۔ "در آن محلہ شیعۂ اھل سنت بسیار بودند".(۲)

۷۔ عبد اللہ ابن عباس امام حسینؑ سے کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں جانا ہی چاہتے ہیں تو یمن جایئے وہاں "قبیلہ ھمدان تمام شیعۂ پدر تو اند"(۳)

۸۔ یزید امیر کوفہ سے پوچھتا ہے کہ حسین کو کیوں قتل کیا؟ ایک شخص اس سوال کا جواب اس جملے سے شروع کرتا ہے "این شخص با چند تن از اقربا و شیعہ خویش بہ کربلا فرود آمدہ".(۴)

یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ روضۃ الشہداء میں لفظ شیعہ، دوست، طرف دار، مددگار کے معنوں میں آیا ہے اور اسی وجہ سے بالعموم اضافی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے جہاں کہیں تنہا آیا ہے وہاں اس کا مضاف الیہ محذوف ہے، جو سیاق کلام سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق ایک فرد پر نہیں بلکہ جماعت پر کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہمیشہ جمع فعل لایا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ معناً اہل سنت کا مقابل نہیں ہے بلکہ دشمن مخالف یا بدخواہ جماعت کا اور اس معنی میں مصنف روضۃ الشہداء کا شمار شیعۂ اہل بیت میں کیا جا سکتا ہے۔

روضۃ الشہداء کے ماخذ:

روضۃ الشہداء تاریخی حیثیت سے کچھ بہت معتبر اور مستند نہیں سمجھی جاتی لیکن اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لئے مصنف نے ماخذ کا حوالہ ضرور دیا ہے اور ہر بات جو کسی کتاب میں لکھی دیکھی اس کو آنکھیں بند کر کے مان نہیں لیا ہے مثال کے لئے ایک مقام پیش کیا جاتا ہے۔ یزیدی لشکر جب کربلا سے واپس ہو کر کوفہ کے قریب پہنچا ہے اس وقت کے حال میں لکھا ہے:

---

(۱) ایضاً ص ۲۱۱۔ (۲) ایضاً ص ۲۱۶۔

(۳) ایضاً ص ۲۳۹۔ (۴) ایضاً ص ۲۵۹۔

"سر آن سرور را بـا سرهـای دیگر بر سر نیزه کرده روبی بکوفه نهادند و نساء و جواری امام حسین را در محمل نشانده می بردند و آن که در بعضی کتب نوشته اند که سرو پای برهنه بر شتران بی مهار نشانده بردند قول ضعیف است و به صحت نرسیده ولی برین وجه که می بردند آن نیز نسبت به اهل بیت اهانت بوده چه ایشان پردگیان حرم عصمت و ستر داران حریم عفت بودند"۔(۱)

(ترجمہ) امام حسینؑ کا سر دوسرے سروں کے ساتھ نیزوں کی انی پر رکھ کر کوفے کو روانہ ہوئے اور امام کی عورتوں اور کنیزوں کو محملوں میں بٹھا کر لے گئے اور یہ جو بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کو سرو پا برہنہ بے محملوں کے اونٹوں پر بٹھا کر لے گئے یہ قول ضعیف ہے اور صحت کو نہیں پہنچا ہے لیکن یہ کہ ان کو لے گئے۔ اہل بیت کی نسبت یہ بھی اہانت تھی کیونکہ وہ حرم عصمت کی پردہ کرنے والی اور حریم عفت میں مستور رہنے والی تھیں۔

روضۃ الشہدا میں جن کتابوں اور مصنفوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

اسمائے کتب:

۱۔ روح الارواح	۲۔ مرأت الجبان (۲)
۳۔ مصابیح القلوب	۴۔ عیون الرضا
۵۔ صحیفۂ رضویہ	۶۔ شواہد النبوۃ
۷۔ روضۃ الاحباب	۸۔ روضۃ الاسلام (۳)
۹۔ روضۃ الواعظین (۴)	۱۰۔ مناقب ابوالموید خوارزمی
۱۱۔ مناقب ابن مردویہ	۱۲۔ کتاب موالید
۱۳۔ معارج	۱۴۔ مقتل ابوالمفاخر رازی

---

(۱) ایضاً ص ۳۴۴۔　(۲) از امام یافعی

(۳) از قاضی سدید الدین خیرفقی　(۴) از شیخ مفید

۱۵۔ مقتل نور الایمہ خوارزمی ۱۶۔ سنن ترمذی
۱۷۔ صحیح نسائی ۱۸۔ مسند امام احمد بن حنبل
۱۹۔ تفسیر معالم التنزیل (۱) ۲۰۔ تفسیر ثعلبی
۲۱۔ تفسیر تیسیر (۲) ۲۲۔ فصل الخطاب (۳)
۲۳۔ کنز الغرائب ۲۴۔ مطالب السئو ل (۴)
۲۵۔ تفسیر کبیر طبری ۲۶۔ سیر کبیر اسمٰعیل بخاری
۲۷۔ ربیع الابرار (۵) ۲۸۔ مختار نامہ
۲۹۔ کنز العباد ۳۰۔ زہرۃ الریاض
۳۱۔ عیون الریاض (۶) ۳۲۔ فردوس الاخبار (۷)
۳۳۔ تاریخ طبری ۳۴۔ تاریخ تیمور
۳۵۔ تاریخ احمد اعثم کوفی ۳۶۔ تواریخ ابوالموید موفق بن احمد مکی
۳۷۔ تواریخ صحابہ ۳۸۔ تاریخ ابوحنیفہ دینوری
۳۹۔ تاریخ العالم ۴۰۔ کتاب ستین الجامع الطائف البساتین (۸)

اسمائے مصنفین:

۱۔ علامہ شیخ جار اللہ ۲۔ امام رضی بخاری
۳۔ سلطان العارفین ۴۔ ابن عباس

---

(۱) از امام محی السنہ (۲) از امام نجم الدین عمر نسفی
(۳) از خواجہ محمد پارسا (۴) مطالب السئول فی مناقب آل رسول از کمال الدین ابن طلحہ
(۵) از زمخشری (۶) غالباً کاتب نے عیون الرضا کی جگہ عیون الریاض لکھ دیا ہے
(۷) از دیلمی (۸) از امام سیف النظر ابوبکر طوسی

۵۔ شیخ سہیل بن عبداللہ تستری ۶۔ امام رکن الدین مسعود بن محمد مشہور بہ امام زادہ

۷۔ سعید بن جبیر　　　　۸۔ محمد اسحاق

۹۔ حاکم خثعمی　　　　۱۰۔ امام اسمٰعیل بخاری

۱۱۔ عبداللہ　　　　۱۲۔ حسن بصری

۱۳۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ۱۴۔ شیخ کمال الدین ابن الخشاب

۱۵۔ ابوسعید غدری　　　　۱۶۔ امام اسمٰعیل خوارزمی

یہ فہرست کتاب پر سرسری نظر ڈال کر بنائی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ نام چھوٹ گئے ہوں۔ اس فہرست پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کو مستند بنانے کی بہت کوشش کی ہے۔ بہر حال اب یہ کتاب مستند سمجھی جائے یا نہ سمجھی جائے اس میں شک نہیں کہ مدت دراز تک یہ واقعات کربلا کے مستند ماخذ کا کلام دیتی رہی ہے۔ پچاسوں کتابیں اسی سے مدد لے کر لکھی گئی ہیں اور سیکڑوں مرثیہ گویوں نے اسی سے مضامین لئے ہیں۔

روضۃ الشہداء کے ترجمے اور خلاصے:

روضۃ الشہداء کا منثور اور منظوم ترجمہ یا خلاصہ کئی زبانوں میں کئی کئی مرتبہ کیا گیا ہے۔ شاہ زادہ سام میرزا صفوی نے اپنا تذکرہ تحفۂ سامی ۹۵۷ ہجری میں تالیف کیا۔ اس میں ایسے دو شاعر ملتے ہیں جنہوں نے روضۃ الشہداء کو فارسی میں نظم کیا تھا۔ ایک ندائی یزدی (۱) دوسرا غواسی (کذا) خراسانی (۲) یہ دونوں شاعر سام میرزا کے ہم عصر تھے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ شاعر معروف محمد بن سلیمان فضولی بغدادی نے روضۃ الشہداء کا ترکی زبان میں ترجمہ کر کے حدیقۃ السعدا اس کا نام رکھا۔ اس نے دوسری کتابوں سے بھی بہت سے مطالب لے کر اپنی کتاب میں شامل کئے جس

---

(۱) تحفہ سامی، ص ۱۳۸۔

(۲) تحفہ سامی، ص ۱۸۵۔

سے وہ ترجمے کی حد سے گذر کر ایک مستقل تصنیف بن گئی۔ مصنف کشف الظنون نے فضولی کا سال وفات ایک جگہ ۹۶۳ ہجری اور ایک جگہ ۹۷۰ ہجری بتایا ہے۔ اسی مصنف نے روضۃ الشہداء کے ایک دوسرے ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو جامی مصری نے سعادت نامہ کے نام سے کیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ ترجمہ بھی ترکی زبان میں ہوگا۔ اردو میں روضۃ الشہداء کا منظوم ترجمہ دکن کے ایک مرثیہ گو شاعر سیوا نے ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں کیا۔ دوسرا منظوم ترجمہ ولی ویلوری نے ۱۱۲۰ھ میں کیا۔ روضۃ الشہداء کا ایک فارسی خلاصہ دہ مجلس کے نام سے میں نے دیکھا ہے جو ۱۱۵۱ھ میں نقل کیا گیا تھا۔ اس میں زوائد کو حذف کر کے ضروری واقعات لے لئے گئے ہیں۔ عبارت اصل کتاب کی ہے جس میں سے اختصار کی غرض سے کہیں کچھ لفظ بدل دیئے گئے ہیں، کہیں بعض جملے حذف کر دیئے گئے ہیں اور کہیں بہت سی عبارت چھوڑ دی گئی ہے۔ اس خلاصے کا اردو ترجمہ فضلی دہلوی نے ۱۱۴۵ھ میں کربل کتھا کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ بھی دہ مجلس کہلاتا ہے۔

حسین واعظ کے تصانیف:

ملا حسین واعظ کی ساحرانہ تقریروں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان کی زبان جتنی خوش بیان تھی، ان کا قلم اتنا ہی مرصع رقم تھا۔ ان کی زبان خوب چلتی تھی مگر ان کا قلم بھی تیز رفتاری میں ان کی زبان سے کم نہ تھا۔ بہت سی کتابیں ان کی تصنیف سے تھیں، جن کتابوں کا حال مجھ کو اب تک معلوم ہو سکا ہے ان کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ مخزن الانشار
۲۔ صحیفۂ شاہی
۳۔ بدائع الافکار فی صنائع الاشعار
۴۔ انوار سہیلی
۵۔ مرصد اسنیٰ
۶۔ اخلاق محسنی
۷۔ فوائد
۸۔ اسرار قاسمی
۹۔ لباب معنوی
۱۰۔ لب لباب

۱۱۔ جواہر التفسیر لتحفۃ الامیر	۱۲۔ مواہب علیہ معروف بہ تفسیر حسینی
۱۳۔ فتوت نامہ سلطانی	۱۴۔ قصہ زاد خزامی
۱۵۔ روضۃ الشہدا	۱۶۔ رسالۂ حاتمیہ
۱۷۔ رسالہ علیہ فی الاحادیث النبی	۱۸۔ مواہب الزحل
۱۹۔ میامن المشتری	۲۰۔ سواطع المریخ
۲۱۔ مفاتیح الزہرہ	۲۲۔ مناہج العطارد
۲۳۔ لوامع الشمس	۲۴۔ لوائح القمر

آخری سات کتابیں علم نجوم کی ہیں اور اُن کا مجموعی نام سبعۂ کاشفیہ ہے۔

ملا حسین واعظ کی کئی کتابیں جیسے انوار سہیلی، اخلاق محسنی، روضۃ الشہدا، تفسیر حسینی بے حد مقبول ہوئیں اور صدیوں مقبول رہیں۔ کسی مصنف کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔

صفوی عہد

آل تیمور کے آخری فرماں روا سلطان حسین میرزا کی وفات سے چار پانچ برس پہلے صفویوں کی سلطنت قائم ہوگئی۔ اس خانوادے کے مورث اعلیٰ شاہ صفی سے شاہ حیدر تک چھ پشتیں مذہبی پیشوائی اور روحانی سیادت کی مسند پر متمکن رہیں اور اس صوفی خاندان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اس طرح ایران کی سلطنت حاصل کرنے سے پہلے بھی یہ خاندان ایرانیوں کے دلوں پر حکومت کررہا تھا۔

شیخ حیدر ایک جنگ میں مارا گیا اور اس کا تین برس کا بچہ اسمٰعیل دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ وہ بچپن ہی سے جلاوطنی، نظر بندی اور قید کی مصیبتیں جھیلتا رہا اور کئی مرتبہ موت کے منہ سے بال بال بچا، وہ ایک حیرت خیز شخصیت کا مالک تھا۔ ابھی اس کی عمر کا تیرہواں سال تھا کہ صرف سات آدمیوں کو ساتھ لے کے سلطنت حاصل کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا اور اپنے بزرگوں کے مریدوں کی مدد سے شہر پر شہر فتح کرتا چلا گیا ایک سال کی قلیل مدت میں اتنی طاقت پیدا کرلی کہ تبریز کو فتح کرکے اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کی اور تخت پر بیٹھتے ہی یہ اعلان کردیا کہ آج سے مذہب شیعہ ایران کا سرکاری مذہب ہے۔ مشیروں نے سمجھایا کہ یہ جگہ اس اعلان کے لئے مناسب نہیں۔ تبریز کی دو تین لاکھ کی آبادی دوسرے عقیدے کے لوگوں پر مشتمل ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ رعایا برگشتہ ہوجائے اور ہنگامہ مچ جائے۔ مگر اسمٰعیل نے کہا کہ خدا میرے ساتھ ہے، ائمہ معصومین میرے ساتھ ہیں۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اگر رعایا نے ایک حرف کہا تو میں سب کو تہ تیغ کردوں گا۔ یہ واقعہ ۹۰۶ھ کا ہے۔ ولیم بیل کا بیان ہے کہ کسی تورانی نے اس واقعے کی تاریخ نکالی "مذہب ناحق"۔ کسی طبیعت دار ایرانی نے اس کو سن کر کہا کہ یہ فقرہ فارسی نہیں ہے، عربی ہے "مذھبنا حق" یعنی ہمارا مذہب حق ہے۔ (۱) لیکن طاہر

نصر آبادی کا قول ہے کہ یہ تاریخ قاضی مسافر نے نکالی تھی، جس کو سن کر شاہ کو بہت غصہ آیا اور اس نے حکم دیا کہ قاضی مسافر کی کھال کھینچ لی جائے۔ مگر جب وہ شاہ کے حضور میں لایا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے یہ تاریخ بادشاہ کی زبان سے کہی ہے "مذھبنا حق" اس کی یہ بات بادشاہ کو پسند آئی اور اس نے قاضی کو معاف کر دیا۔ (۲)

صفوی بادشاہوں نے اپنے مذہبی عقائد اور سیاسی مصالح کی بنا پر آل رسول سے عقیدت اور ان کے مخالفوں سے نصرت کے جذبات کو ابھارنے اور ترقی دینے کے لئے ہر طرح کی تدبیریں اختیار کیں۔ شاہ اسمٰعیل نے فضائل ائمہ کی محفلوں اور مصائب ائمہ کی مجلسوں کو خوب رواج دیا۔ مجلسوں میں پڑھنے کے لئے کتابیں لکھی گئی ہوں گی اور مرثیے کہے گئے ہوں گے۔

شاہ طہماسپ اور مذہبی شاعری:

شاہ اسمٰعیل صفوی شاعر تھا۔ خطائی تخلص کرتا تھا۔ فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھا۔ (۳) ممکن ہے کہ اس نے کوئی مرثیہ بھی کہا ہو۔ اس نے چوبیس برس سلطنت کر کے ۹۳۰ھ میں انتقال کیا۔ (۴) اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا شاہ طہماسپ تخت نشین ہوا۔ اس نے پچاس برس سے زیادہ (۹۳۰ھ۔۹۸۴ھ (۱۵۲۴ء۔۱۵۷۶ء)) سلطنت کی۔ یہ بادشاہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا اور اس نے بھی مذہب شیعہ کی ترویج و استحکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ تاریخ عالم آرائے عباسی میں لکھا ہے کہ شاہ طہماسپ کو ابتدائے سلطنت میں شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ مگر

---

(۱) مفتاح التواریخ، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔

(۲) تذکرہ طاہر نصر آبادی، مطبوعہ ایران، ص ۲۷۴۔

(۳) صبح گلشن، ص ۱۵۲۔

(۴) شاہ جہاں کرد جہان وداع، مصرع تاریخ ہوا۔ صبح گلشن، ص ۱۶۲۔

آخر میں مذہبیت کے غلبے سے وہ شعرا کو وسیع المشرب خیال کرنے لگا تھا۔ اس لئے ان کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ اور ان کو قطعہ یا قصیدہ پیش کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ مولانا محتشم کاشی نے ایک عمدہ قصیدہ بادشاہ کی مدح میں کہہ کر شاہزادی پری خان خانم کے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے کچھ صلہ نہ دیا اور کہا کہ میں اس امر پر راضی نہیں ہوں کہ شعرا میری مدح میں مبالغہ کر کے دروغ گوئی کے مرتکب ہوں ان کو چاہئے کہ حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ معصومین کی شان میں قصیدے کہہ کر اول ان حضرات کی ارواح مقدسہ سے اور اس کے بعد مجھ سے صلے کی توقع کریں۔ محتشم نے جب یہ خبر سنی تو مرحوم ملا حسن کاشی کے بے نظیر ہفت بند کے جواب میں ایک ہفت بند حضرت علیؑ کی شان میں کہہ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور کافی صلہ پایا۔ اس کے بعد پائے تخت کے شاعروں نے بھی ہفت بند کہنا شروع کیا۔ کوئی پچاس ساٹھ ہفت بند بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ اور ان سب کے مصنف صلے سے سرفراز ہوئے۔

تاریخ عالم آرائے عباسی کا بیان:

تاریخ عالم آرائے عباسی کے مصنف کا یہ بیان فارسی شاعری کی تاریخ میں بالعموم اور مدائح ائمہ ہدا اور مراثی شہدائے کربلا کی تاریخ میں بالخصوص، بہت اہمیت رکھتا ہے اس لئے وہ یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

"در آن هنگام در اردوی معلی و ممالك محروسه شاعران سخنور و سخنوران بلاغت گستر بی شمار بودند. در اوائل حال حضرت خاقانی جنت مکانی را توجه تمام بحال این طبقه بود. چندگاه میرزا شرف جهان و مولانا حیرتی از همصحبتان بزم اقدس و معاشران مجلس مقدس بودند و در اواخر ایام حیات که در امر معروف و نهی منکر مبالغهٔ عظیم می فرمودند، چون این طبقه علیه را وسیع المشرب شمرده از صلحا و زمرهٔ اتقیا نمی دانستند زیاده توجهی بحال ایشان نمی فرمودند و راه گزرانیدن قطعه و قصیده نمیدادند. مولانا محتشم کاشی قصیدهٔ غرا در مدح آنحضرت و قصیدهٔ دیگر در مدح مخدره زمان شاهزاده پری خان خانم بنظم آورده از کاشان فرستاده بود. بوسیلهٔ شاهزادهٔ مذکور

معروض گشت. شاہ جنت مکان فرمودند کہ من راضی نیستم کہ شعرا زبان بمدح و ثنای من آلایند ، قصائد در شان حضرت شاہ ولایت پناہ و ائمہ معصومین علیھم السلام بگویند: صلہ اول از ارواح مقدسۂ حضرات و بعد از آن از ما توقع نمایند ، زیرا کہ بفکر دقیق و معانی بلند و استعارہ ھای دورازکار در رشتۂ بلاغت در آوردہ بملوك نسبت می دھند کہ بمضمون از احسن اوست اکذب او، اکثر در موضع خود نیست. اما اگر بحضرات مقدسات نسبت نمایند کہ شان معانی نشان ایشان بالاتر از آنست، محتمل الوقوع است، غرض کہ جناب مولانا صلۂ شعر از جانب اشرف نیافت چون این خبر بمولانا رسید ھفت بند مولانا حسن کاشی کہ در شان حضرت شاہ ولایت، سلطان سریر ھدایت، در رشتۂ نظم کشیدہ و ھمانا از الھام الٰھی ست و دست سخنوران زمان از دامن آن کوتاہ، جواب گفتہ بخدمت فرستاد ، صلۂ لائق یافت، شعرای پای تخت ھمایون شروع در ھفت بند گوئی کردہ۔ قریب پنجاہ شصت ھفت بند غرا بمعرض عرض در آوردہ شد و ھمگی بجائزہ و صلہ مفتخر و سرفراز گشتند‘‘(۱)

آزاد بلگرامی کی غلط فہمی:

مندرجہ بالا بیان کو ادبیات ایران کی تاریخ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ اس عبارت کو لفظ بلفظ نقل کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس کے متعلق علامہ آزاد بلگرامی اور پروفیسر براون انگلیسی کو کچھ غلط فہمیاں ہوگئی ہیں جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علامہ آزاد نے اپنے مشہور تذکرۂ شعرا خزانۂ عامرہ میں محتشم کا حال لکھتے ہوئے تاریخ عالم آرائے عباسی کا حوالہ دے کر اس بیان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ یہ خلاصہ بالکل صحیح ہے لیکن ’’چون این خبر بہ مولانا رسید ‘‘ کے بعد لکھتے ہیں:

---

(۱) تاریخ عالم آرائے عباسی مطبوعہ طہران، ص ۱۲۹۔

''ترکیب بند مرثیہ سید الشہداء رضی اللہ عنہ گفتہ فرستاد و بجائزۂ لائقہ کامیاب گردید''(۱)

یعنی یہ خبر سن کر محتشم نے امام حسینؑ کا ترکیب بند مرثیہ کہہ کر بادشاہ کو بھیجا اور کافی صلہ حاصل کیا۔ حالانکہ تاریخ مذکور میں صاف لکھا ہے کہ محتشم نے ملا حسن کاشی کے ہفت بند کے جواب میں ہفت بند کہہ کر بھیجا۔ یہ غلط فہمی یوں پیدا ہوئی ہوگی کہ محتشم کا ہفت بند مشہور نہ تھا اور غالباً علامہ آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ برخلاف اس کے محتشم کا مرثیہ نہایت مشہور تھا۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جتنی شہرت حسن کاشی کے ہفت بند کو حاصل تھی اتنی ہی محتشم کاشی کے مرثیے کو بھی حاصل تھی، پھر مرثیہ محتشم ہفت بند کاشی کی طرح ایک ترکیب بند نظم ہے اور اس کا مشہور و معروف نام بھی ہفت بند سے ملتا ہوا یعنی دوازدہ بند ہے۔ نام میں مشابہت، شکل میں یکسانی اور شہرت میں برابری ان وجوہ سے علامہ مذکور کو خیال ہوا ہوگا کہ محتشم نے ہفت بند کاشی کے جواب میں جو نظم لکھ کر کافی صلہ پایا تھا وہ یہی مرثیہ ہوگا۔ ہفت بند محتشم سے ناواقفیت کی حالت میں یہ خیال پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔

پروفیسر براون کی غلط فہمی:

تاریخ ادبیات ایران کے فاضل مصنف پروفیسر براون کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی۔ اور وہ اس غلط فہمی کی بنا پر پے در پے غلطیاں کرتے چلے گئے۔ ذیل میں پروفیسر مذکور کی اصل عبارت نقل کی جاتی ہے:

There upon Muhtashim composed his celebrated haft band or poem of seven verse strophes, in praise of the Imams and this time was duly and amply rewarded...This poem is cited in most of the anthologies which include in uhtas ham, but most fully in the Kharabat of Ziya Pasha(vol 2, pp. 197-200) In this fullest form it comprises twelve strophes, each consisting of seven verses and each concluding with an additional verse in a different rhyme ,

(۱) خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور، ص ۲۰۵۔

thus comprising in all ninty six verses(1)

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

یہ خبر سن کر محتشم نے مدح ائمہ میں اپنا مشہور ہفت بند کہا: یعنی ایسی نظم جس میں سات سات شعروں کے بند ہیں اور اس مرتبہ ان کو مناسب اور کافی صلہ ملا...جن بیاضوں میں محتشم کا کلام شامل ہے ان میں سے اکثر میں یہ نظم نقل کی گئی ہے لیکن سب سے زیادہ مکمل طور پر ضیا پاشا کی خرابات (۲) (جلد دوم، ص ۱۹۷، ۲۰۰) میں ملتی ہے۔ اس مکمل صورت میں وہ بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں سات (ہم قافیہ) شعر اور آخر میں ایک فاضل شعر مختلف قافیے میں ہے۔ اس طرح پوری نظم میں چھیانوے شعر ہیں۔

یہ لکھنے کے بعد پروفیسر براون نے بخیال خود ہفت بند محتشم کے تین بند نقل کئے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ پروفیسر براون مرثیۂ محتشم کو ہفت بند محتشم سمجھتے تھے، اس غلط فہمی کے علاوہ ان کے منقولہ بالا بیان میں حسب ذیل غلطیاں اور موجود ہیں:

۱۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس نظم میں ائمہ کی مدح کی گئی ہے حالانکہ اس کا موضوع شہادت امام حسین ہے۔ ہفت بند محتشم میں بھی متعدد ائمہ کی مدح نہیں ہے، بلکہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی مدح ہے۔

۲۔ ہفت بند کی تعریف یہ کی ہے، ایسی نظم جس میں سات سات شعروں کے بند ہوں درآنحالیکہ ہفت بند کا نام ہی بتاتا ہے کہ وہ سات بندوں کی نظم ہونا چاہئے۔

۳۔ ہر بند کے آخر میں جو بیت مطلع کی شکل کی ہوتی ہے اس کو وہ فاضل شعر کہتے ہیں اور بند میں اس کا شمار نہیں کرتے، مگر حقیقتاً وہ بند کا جزو ہوتی ہے۔

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران، ج ۴، ص ۱۷۳۔

(۱) ضیا پاشا ایک ترکی ادیب اور شاعر تھا، اس نے عربی فارسی اور ترکی اشعار کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا جو خرابات کے نام سے قسطنطنیہ میں ۱۲۹۲ھ میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔

ان غلطیوں کے اسباب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ پروفیسر براون نے نہ حسن کاشی کا ہفت بند دیکھا نہ محتشم کاشی کا۔ وہ محتشم کے مرثیے کو اس کا ہفت بند سمجھے۔ اس مرثیے میں بارہ بند ہیں۔ اس کو ہفت بند قرار دینے کے لئے اس کے ہر بند کے اشعار کی تعداد پر نظر کی تو وہ آٹھ نکلے، چونکہ ہر بند کا آخری شعر صورت میں اور شعروں سے مختلف ہوتا ہے، اس لئے اس کو شمار سے خارج کر کے ہر بند میں سات شعر قرار دیئے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہفت بند ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں سات شعر ہوں۔

حرفی اصفہانی:

حرفی اصفہانی نے مقدس میں نشو و نما پائی۔ ۹۷۰ء میں قزوین میں آیا اور ملا کاشی کے ہفت بند پر کہہ کر شاہ طہماسب کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو خلعت اور پچاس تومان عطا کئے۔ (۱)

حیرتی تونی:

حیرتی تونی نے مرو میں نشو و نما پائی۔ اس نے کثرت سے اشعار کہے ہیں خاص کر ائمہ اطہار کی مدح و منقبت میں۔ اس نے سیاحت بہت کی تھی۔ کسی نے مال کے لالچ میں اس کو قتل کر دیا۔ (۲) وہ اپنے وطن سے عراق عجم چلا گیا اور وہاں شاعری میں نام پیدا کیا۔ حاسدوں نے اس کا یہ شعر شاہ طہماسپ تک پہنچا دیا۔

از حسد امروز زاهد منع ما از باده کرد　　　ورنه کی آن تا مسلمان را غم فردای ماست

بادشاہ کو پاس شریعت سے غصہ آ گیا۔ حیرتی گیلان بھاگ گیا اور کچھ دن بعد حضرت علیؑ کی منقبت میں ایک قصیدہ کہا، جس میں حضرت علیؑ کو اپنا شفیع بنایا اور وہ قصیدہ بارگاہ شاہی میں پیش کیا۔ شاہ نے اس کا قصور معاف کر کے اس پر نظر عنایت فرمائی۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

---

(۱) خزانۂ عامرہ ص ۱۸۵،۱۸۶۔　　　(۲) آتش کدہ۔

به هیچ خانه هم نیست ای شه دوسرا   تو‌ئی چو شاه ولایت ولایتی بنما(۱)

حیرتی نے شاہ طہماسپ کے حکم سے کتاب بہجۃ المناہج کو نظم کر کے کتب المعجزات اس مثنوی کا تاریخی نام رکھا، جس سے اس کا سال اتمام ۹۸۴ھ نکلتا ہے اور یہی شاہ طہماسپ کی سلطنت کا آخری سال تھا، بیس ہزار آٹھ سو بیت کی اس ضخیم مثنوی کا ایک قلمی نسخہ سید رضا علی رضوی کے قلم کا لکھا ہوا میں نے دیکھا ہے جس کی کتابت ۱۹ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۸۸۱ء کو تمام ہوئی تھی۔ اس مثنوی کے بارے میں ہماری معلومات اس مثنوی کے حسب ذیل اشعار سے ماخوذ ہے:

سبب نظم کتاب

کتابی سر بسر تاریخ و اقوال   ز حال مصطفیؐ و حیدرؑ و آل

مرا حاصل شد از نامش نتایج   که جان را بهجتی بود از مناهج

که از ارکان دولت کامیابی   بمن کرد از ره رحمت خطابی

که صادر گشت امر حضرت شاه   که از پیدا و پنهانست آگاه

که این تاریخ را منظوم سازی   بنظم این نثر را مرقوم سازی

کتاب بهجه را آورد پیشم   قرین شد بهجتی از بخت خویشم

در بیان خاتمۂ کتاب گوید:

برون آورد چون من تا توانی   ز نثر مغلق این نظم روانی

برون آمد ز لطف شاه یعنی   ز نثر این نظم چون از لفظ معنی

الهی گردد این نظم پریشان   قبول خاطر خدام ایشان

---

(۱) خزانہ عامرہ، ص ۱۸۴۔

قطعۂ تاریخ ختم کتاب:

چو دانایان پی تاریخ اتمام | کمال سعی را داد ندا انجام
هم از اعجاز این ابیات فاخر | کتب المعجزات آمد بخاطر
ازین معنی دل من فیض یابست | که هم تاریخ و هم نام کتابست
چو دل در فکر تعیین عدد شد | دوباره ده هزار و هشت صد شد

۲۰۸۰۰/ابیات مثنوی

اس مثنوی میں سبب نظم کتاب کے ذیل میں شاہ طہماسپ کی جو مدح کی گئی ہے اس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

درمدح حضرت شاہ عالم پناہ:

منور ساخت از مه تا به ماهی | چراغ دولت طهماس شاهی
به هر آوازهٔ دولت در افگند | بدولت نسل اعدا را بر افگند
نشان فتح و دولت در جهان خواند | نه از رومی نه از ازبك نشان ماند
بدولت در جوانی شد موید | جوان شد دولت آل محمدؐ
کهن سالان بی دین بر فتادند | قدم ننهاده در کین سر نهادند
مغ از میخانها مسجد نشین شد | خم می از خجالت در زمین شد
بزور نهی او شد از توهم | بنای فسق از روی زمیں گم
بنوعی کافران در خاك پستند | که پیدا نیست در عالم که هستند

عباس اعظم اور مذہبی شاعری:

شاہ عباس اعظم کو ائمہ معصومین سے بے حد عقیدت تھی۔ ملا شانی نے حضرت علیؑ کے ایک غزوہ کا حال نظم کیا تو بادشاہ نے اس کو سونے میں تول دیا۔ ملا لطفی نیشاپوری نے اس واقعہ پر یہ رباعی کہی:

شاها ز کرم جهان منور کردی	ملك دل عالمی مسخر کردی
شاعر که بخاك ره برابر شده بود	برداشتی و برابر زر کردی

۱۰۱۰ھ میں شاہ عباس نے مشہد مقدس تک پیدل سفر کیا۔ مرزا احسن علی نصر آبادی نے اس واقعہ پر یہ قطعۂ تاریخ کہا:

از حق تو فن آمد شاه جهان که سازد	چون چار رکن گیتی رکن هدی مسخر
از مطلع دل او مهر طواف سرزد	طوف امام ضامن کز گفتهٔ پیمبر
هفتاد حجّ اکبر آمد یکی طوافش	این نکتهٔ صحیح است نزدیك نکته پرور
صلفش رفیق و توفیق همراه و همسفر بخت	در ره پیاده پویان چون آفتاب انور
تاریخ این سفر خواست از شاه طبع گستاخ	گفتا "پیاده کردم هفتاد حج اکبر" (۱)

صفوی عہد میں مرثیہ گوئی:

صفوی بادشاہوں نے شاعروں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ عام شاعری کو زوال اور مذہبی شاعری کو ترقی ہو۔ ایرانیوں کی مذہبی شاعری دو شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ایک کا موضوع ہے مناقب ائمہ بالخصوص مدح حضرت علیؑ اور دوسرے کا مصائب ائمہ بالخصوص شہادت امام حسینؑ۔ دوسرے شعبے کی نظمیں مرثیہ کہلاتی ہیں۔ صفوی عہد سے بہت پہلے ایران میں عزاداری کا رواج ہو چکا تھا اور بہت سے مرثیے کہے جا چکے تھے۔ صفوی عہد میں عزاداری کا مرتبہ شرعی واجبات سے کچھ ہی کم تھا۔ شاہ طہماسپ کے اواخر عہد میں ۹۸۱ھ میں ملا محمد صالح برغانی نے روضۃ الشہدا کے طرز پر مخزن البکا نام کی کتاب لکھی۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"بعد از فرائض اعظم اعمال مندوبه و اشرف قربات شرعیه گریستن و گریانیدن و محزون شدن و محزون ساختن بر مصیبت سید الشهدا خامس آل عبا ابی عبد الحسین است"

---

(۱) تذکرہ نصر آبادی، ص ۴۸۵۔

یعنی شرعی فرائض اور واجبات کے بعد امام حسینؑ کی مصیبت پر رونا اور رلانا، مغموم ہونا اور مغموم کرنا سب سے عظیم عمل ہے۔

ان حالات میں صفوی سلطنت کی سوا دو سو برس کی طویل مدت میں مرثیوں اور مرثیہ گویوں کی کثرت یقینی ہے۔ لیکن اب نہ اس عہد کے مرثیے ملتے ہیں نہ مرثیہ گویوں کے حالات۔ تذکرہ نویسوں نے مرثیہ گویوں کی طرف سے جس حد کی بے اعتنائی برتی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے فرزند سام میرزا صفوی نے شاہ طہماسپ کے عہد میں ۹۵۷ھ میں تذکرہ تحفۂ سامی تالیف کیا جس میں تقریباً سات سو شاعروں کا ذکر ہے۔ ان میں سے بہتوں نے مرثیے بھی ضرور کہے ہوں گے۔ مگر کسی کے مرثیے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح میرزا محمد طاہر نصر آبادی نے شاہ سلیمان صفوی کے عہد میں ۱۰۸۳ھ میں اپنا تذکرہ شعرا تالیف کیا، جس میں تقریباً ایک ہزار شاعروں کا ذکر ہے۔ ان کثیر تعداد میں سے صرف ایک شاعر میرزا صابر کے ایک مرثیے کا فقط ایک شعر نقل کیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

بر نیزہ کردۂ سر گلدستۂ رسول　　　ای روزگار خوش گلی آوردۂ ببار

میرزا صابر:

میرزا صابر سادات زوارہ میں سے تھے۔ اس تذکرے کی تالیف سے کچھ زمانہ پہلے وہ ہندوستان چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے بڑی عزت حاصل کی اور بہت دولت پیدا کی۔ اسی لئے مولف تذکرہ نے ان کو امرا و خوانین کے زمرے میں جگہ دی ہے۔(۱)

حاصلی تبریزی:

حاصلی تبریزی سام میرزا کا ہم عصر تھا۔ تحفۂ سامی میں اس کو ابریشم فروش بتایا گیا ہے(۲) تذکرہ

---

(۱) تذکرہ طاہر نصر آبادی، ص ۶۵، ۶۶۔　　(۲) تحفہ سامی، ص ۱۲۳۔

حسینی میں اس کے ایک مرثیے کا مطلع درج کیا گیا ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

سوسن ماتم زده لالهٔ خونین کفن　　　سرخ وسیه گشته اند بهر حسینؑ و حسنؑ(۱)

حیدر تونی:

شاہ طہماسپ صفوی کے زمانے کا ایک ایرانی شاعر حیدر تونی ہندوستان آ گیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی عہد ہمایون بادشاہ کے چند شاعروں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''دیگری حیدر تونیائی است مردی اهل و درو ادی نغمه بی بدل بود ، سلیقه به شعر و موسیقی مناسب داشت ، اکثر اوقاتش در هند بسر شده هجو ملك المنجمین عصر محمد همایون پادشاه را که در مقام پنجگاه بسته عجوبهٔ روزگاراست و نادره ادوار ، این مطلع او را که در تعزیت حضرت امام شهید مقبول مقتول فلذه کبد الرسول و البتول علیه السلام نقش بسته در ایام عاشورا در معارك می خوانند''۔

ماه محرم آمد و شد گریه فرض عین　　　گر بیم خون بیاد لب تشنهٔ حسینؑ(۲)

ملک المنجمین نے ایک دوا بادشاہ کے حضور میں پیش کی کہ اگر اس کو آدمی کے بدن پر مل دیں تو تلوار کارگر نہیں ہوتی۔ بادشاہ کے حکم سے ایک مجرم پر آزمایش کی گئی مگر وہ تلوار سے کٹ گیا۔ اس پر حیدر نے فی البدیہہ ایک ہجویہ رباعی کہہ دی۔ محرم ۹۶۶ھ میں حیدر نے انتقال کیا۔ (۳)

ظہوری ترشیزی:

شاہ عباس اعظم کے زمانے کا ایک شاعر ظہوری ترشیزی (متوفی ۱۰۲۴ھ) ہندوستان چلا آیا

---

(۱) تذکرۂ حسینی، ص ۱۰۲۔

(۲) منتخب التواریخ، ج ۱، ص ۴۸۰، ۴۸۱

(۳) صبح گلشن، ص ۱۴۵۔

اور دکن میں ریاست بیجاپور کے فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔اس بادشاہ کو عزاداری میں بہت انہماک تھا۔اور اس کے حکم سے دکن میں عزاداری کا بڑا رواج ہوگیا تھا بقول ظہوری:

در هر محرم از اثر حکم نافذش صحن دکن ز غلغلهٔ نوحه کربلاست

اس کے زمانے میں اردو اور فارسی میں بہت مرثیے کہے گئے۔ظہوری کے چھ مرثیے مجموعۂ واقعات ملا مقبل وغیرہ مطبوعہ مطبع نول کشور، لکھنؤ میں شامل ہیں۔ان مرثیوں کے عنوان پر "از واقعات ملا ظہوری" درج ہے۔لیکن یہ سب مرثیے آذری اور محتشم کی تقلید میں ترکیب بند ہیں۔ان کو واقعات کہنا درست نہیں، واقعات کی نوعیت آگے چل کر مقبل اصفہانی کے مرثیوں سے واضح ہوگی۔

ظہوری کے چھ مرثیوں میں سے پانچ اسی بحر میں ہیں۔جس میں آذری اور محتشم کے مرثیے ہیں ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

ماتم سراست دهر و گر ماه ماتم است دیگر محرم آمد و صبر قرار رفت

ایام ماتم است به ماتم سرا نشین آه و فغان که قوت آه و فغان نماند

ماه محرم است حرام است خرمی

صرف ایک مرثیہ دوسری بحر میں ہے۔جس کا مطلع یہ ہے:

نماند هوش مرا این خروش و افغان چیست

ایک مرثیے کے آخری بند کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ مجلس عزا میں بہت گریہ کرتا تھا اور زمانۂ عزا میں سیاہ کپڑے پہنتا تھا، تخت شاہی پر نہیں بیٹھتا تھا:

می کرد کاش ابر به صحرای کربلا کاری که ابر چشم براهیم شاه کرد

نخل قدش که سدره ازو آه می کشد لرزان بباد آه چو شاخ گیاه کرد

اثبات رو سفیدی خود کرد در لباس و ز جامهٔ سیاه حنایی گواه کرد

روشن کنیم مردمك چشم مردمی ست — این کعبهٔ مراد که کسوت سیاه کرد

در ماتم حسینؑ نه زد تکیه بر سریر — هم آسمان به بیں که زمین تکیه گاه کرد

آخری شعر سے شاید یہ مراد بھی ہو کہ بادشاہ سوتے وقت تکیے پر سر نہیں رکھتا تھا۔ میر مونس لکھنوی کے شعر ذیل سے شاہان اودھ کا یہی طریقہ معلوم ہوتا ہے:

عجب ملال کا ہے روز روز قتل حسین — کہ بادشاہ بھی تکیے پہ سر نہیں رکھتے

ظہوری بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کہتا ہے:

دوران نشد که روز مخالف چو شب کند — این کار را شهنشه عادل لقب کند

روزی که سرور شهدا بی سپاه بود — هنگام کارزار براهیم شاه بود

اور خوشامد میں اتنا بڑھ جاتا ہے:

ایام از آن بکام حسینؑ و حسنؑ نبود — کان روز شهریار سریر دکن نبود

ایک مرثیے کے چند شعر ظہوری کے کلام کا نمونہ پیش کرنے کی غرض سے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

فریاد از آن زمان که بمیدان کربلا — از ضعف شد خموش رجز خوان کربلا

افغان از آن زمان که فتادند تفته جان — پروانه های شمع شبستان کربلا

آه از دمی که پروگیان از پی وداع — گشتند جمع پیش پریشان کربلا

نم نیست در جگر که به سامان توان گریست — بر روزگار بی سرو سامان کربلا

زهر اجل کجاست که در شهد زندگی — لذت نمانده بی نمك خوان کربلا

تا حشر داغ لاله سیاهی می فگند — در آتش است از غم ریحان کربلا

از زخم تیر خوش زرهی بافت روزگار — بر پیکر مبارز میدان کربلا

با آن جمال شاهد رحمت ضرور داشت — گلگونهٔ ز خون شهیدان کربلا

گردد برات عفو مصیبت کشان رقم — روز جزا ز دفتر دیوان کربلا

آغشته نالهای ظهوریؔ بخون که هست — از بلبلان نو گل بستان کربلا

محتشم کاشی اور ملا مقبل اصفہانی

مرثیہ گوئی کی دنیا میں ایران کے جن دو شاعروں نے لازوال شہرت حاصل کی، وہ ہیں ملا محتشم کاشی اور ملا مقبل اصفہانی۔ اس لئے ان کا حال امکانی تفصیل کے ساتھ لکھا جائے گا۔ ان دونوں شاعروں کے درمیان میں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ کا فصل ہے۔ لیکن دونوں صفوی عہد میں گزرے ہیں ایک اس عہد کے شروع میں اور ایک اس کے آخر میں۔

محتشم کاشی: دوسروں کے بیانات

محتشم کا وطن کاشان تھا۔ اسی کی مناسبت سے کاشی کہلاتے ہیں۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کا فرزند شاہ زادہ سام میرزا صفوی محتشم کا ہم عصر تھا وہ لکھتا ہے:

"مولانا محتشم از کاشان است و به بزازی مشغول است و در شعر طبعش بد نیست"(۱)

تاریخ عالم آرائے عباسی کا مصنف بھی محتشم کا ہم عصر تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مولانا محتشم خطہ کاشان سے ہیں۔ شاعری میں شہرۂ آفاق ہیں، جو صنائع و بدائع اپنے اشعار میں لاتے ہیں وہ دوسرے شاعروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ بہت سے قصیدے اور بے شمار غزلیں اور ترکیب بندان کی تصنیف سے ہیں، ان کی رنگین عاشقانہ غزلیں خاص طرز کی ہیں۔ (۲)

ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ محتشم غزل اور قصیدہ نظم کرنے میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس

---

(۱) تحفہ سامی مطبوعہ تہران، ص ۱۹۰۔

(۲) تاریخ عالم آرائے عباسی مطبوعہ تہران، ص ۱۳۰۔

نے غزل اور رباعی کے چند دیوان ترتیب دیئے اور ہر ایک کا جداگانہ نام رکھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دوست کی سفارش کے ضمن میں خانخانان عبدالرحیم کی مدح کہہ کر شیراز سے ہند بھیجی جو قبول ہوئی۔ ۹۹۶ھ میں انتقال کیا۔

"ترکیب بند مراثی که در عزای گلگون قبای کربلا بر آمیخته جگر کاو ایمانیان است"

اس کے بعد محتشم کے مرثیہ دوازدہ بند سے پچپن شعر نقل کئے ہیں۔

خاندان صفویہ کے اختتام کے کچھ ہی دن بعد والہ داغستانی نے اپنا ضخیم تذکرہ ریاض الشعرا لکھا اس میں محتشم کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ مولانا محتشم کاشی شعرائے مکرم میں معظم اور فصحائے محترم میں محتشم ہیں۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ کے زمانے میں دنیا میں کوس یکتائی بجاتے تھے۔ ان کا دیوان معروف اور اشعار مشہور ہیں۔(۱)

امین احمد رازی بھی محتشم کا ہمعصر تھا۔ وہ ہفت اقلیم میں لکھتا ہے کہ مولانا محتشم اس زمانے کے معروف شاعروں میں ہیں۔ ان کی کچھ غزلیں بعض وجوہ سے عذوبت سے خالی ہیں، لیکن قصیدے جتنے ہیں سب میں نہایت جودت اور ہمواری ہے۔

ریاض الشعرا کی تصنیف کے چند سال بعد آذر اصفہانی نے اپنا تذکرہ آتشکدہ لکھا۔ اس میں مختلف مقامات کے شعرا کو ان مقامات کے تحت میں یکجا کر دیا ہے۔ محتشم کا ذکر عراق عجم کے شاعروں میں کیا ہے۔ لکھتا ہے مولانا محتشم اندبار کے رہنے والے تھے۔ شاہ طہماسپ صفوی کے مداح اور اس زمانے کے شعرائے فصاحت شعار میں ممتاز تھے۔ اکثر فنون نظم میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ بالخصوص قصیدہ اور غزل میں بلند اور متین قطعات عاشقانہ بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات مرض محبت میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ایک دیوان مسمّی بہ جلالیہ اور ایک دیوان مسمّی بہ نُقل عشاق مرتب کیا۔ اور ان دونوں کتابوں میں اپنا اور اپنے معشوق کا مفصل حال نظماً

---

(۱) ریاض الشعرا، قلمی، نوشتہ ۱۱۸۲ھ حرف میم، یہ نسخہ تاریخ تصنیف سے صرف تیرہ برس بعد کا لکھا ہوا ہے۔

اور نثراً بیان کیا ہے۔ ابتدائے عمر سے شعر کہتے تھے۔ چند دیوان مرتب کئے اور زمانہ تصنیف کی نسبت سے صبائیہ اور شبابیہ ان کا نام رکھا۔ مثنوی اور رباعی نہیں کہی۔ کافی عمر پائی۔ (۱)

صاحب خزانۂ عامرہ علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ محتشم کاشی استاد عالیمقام اور سخن سنجوں کی جماعت میں صاحب احتشام ہیں۔ انہوں نے ایک مختصر مثنوی عبدالرحیم خانخاناں کی مدح میں لکھ کر کاشان سے ہندوستان بھیجی اور اس میں ایک شخص کی طرف سے عرض حال کیا۔ خانخانان نے ملا محتشم کی سفارش سے اس شخص کی درخواست منظور کر کے اس کا مقصد پورا کر دیا۔ (۲)

رضا قلی خان ہدایت طبرستانی طہرانی نے اپنا ضخیم تذکرہ مجمع الفصحا ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد حکومت میں ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں تمام کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ محتشم کاشانی شاہ طہماسپ کے معاصر و مداح اور مشہور شعرا میں سے تھے۔ ایام شباب میں شاطرہ جلال سے عشق بازیاں کیں اور غزلیں کہہ کر ان کا نام جلالیہ رکھا۔ اور ان پر ایک نثر لکھ کر اسے نقل عشاق کے نام سے موسوم کیا۔ ان کا دیوان میری نظر سے گزرا، صبائیہ اور شبابیہ پر مشتمل ہے۔ (۳)

پروفیسر براون لکھتے ہیں کہ عہد صفوی کے کثیر التعداد شعرا جنہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ائمہ کے فضائل و مصائب کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا تھا، ان میں محتشم کاشی سب سے ممتاز ہیں، ان کا انتقال ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۸ء میں ہوا۔ (۴)

آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ ناظم تبریزی نے اپنے تذکرے میں محتشم کی وفات ۱۰۰۰ھ میں لکھی ہے اور والہ داغستانی لکھتا ہے کہ "درد محتشم" اس کی تاریخ رحلت ہے۔ اس مادے میں ہزار سے چار

---

(۱) تذکرہ آتشکدہ، مطبوعہ۔

(۲) خزانۂ عامرہ مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۰۰ء، ص ۴۰۴۔

(۳) مجمع الفصحا، مطبوعہ تہران، ج ۲، ص ۳۶۔

(۴) تاریخ ادبیات ایران، ج ۴، ص ۱۷۲۔

عدد کم ہیں۔(۱)

محتشم کاشی؛ خود محتشم کے بیانات:

مختلف ماخذوں سے محتشم کے حالات جو کچھ معلوم ہوے وہ اوپر درج کر دیئے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود محتشم کے کلام سے ان کے حالات پر کیا روشنی پڑتی ہے، میرے پیش نظر کلیات محتشم کا وہ نسخہ ہے جو ۱۳۰۰ھ میں بمبئ میں چھپا تھا اور میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں سب سے پہلے رسالہ جلالیہ ہے۔

''رسالۂ جلالیہ'': مصنف کا بیان ہے کہ ۹۷۰ھ میں شاطر جلال نے اصفہان سے آکر کچھ دن کاشان میں قیام کیا۔ اس کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ طفل صغیر سے لے کر شیخ کبیر تک اس پر شیفتہ ہو گیا۔ اس کے عشق سے میرے دل پر جو کچھ گذری اور میرے اور اس کے درمیان جو کچھ واقع ہوا اس کو میں غزلوں کی شکل میں بیان کرتا رہا۔ ان غزلوں کی تعداد چونسٹھ ہے جو اتفاق سے لفظ جلال کے اعداد کے مطابق ہے اور ان کے مجموعے کا نام جلالیہ ہے۔ ۹۸۰ھ میں میرزا سلیمان حسابی تذکرہ اوصاف البلاد کی تالیف میں مصروف تھے اور میری ان غزلوں کو کتاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی فرمائش سے میں نے ہر غزل کے شروع میں وہ حالات لکھ دیئے جو اس غزل کی تصنیف کے محرک ہوے تھے۔ انہیں نثری عبارتوں کے مجموعے کا نام آذر اصفہانی اور ہدایت طبرستانی نے نقل عشاق بتایا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

قصائد محتشم:

کلیات محتشم میں رسالہ جلالیہ کے بعد مجموعہ قصائد ہے۔ اس مجموعے میں ایک ایک قصیدہ محمد شاہ بادشاہ دکن، یوسف عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور اور شہنشاہ اکبر اعظم کی مدح میں اور تین قصیدے

---

(۱) خزانہ عامرہ، ص ۱۰۵۔

مرتضٰی نظام شاہ بحری کی مدح میں ہیں۔ ان تینوں قصیدوں کے ضروری اقتباسات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)

زمان زمان زسرم از وساوس بشری | سپاہ غم بصد آشوب می کشد لشکر
گھی ز فوت برادر غمی برابر کوہ | دل مرا ز تسلط نمودہ زیر و زبر
گھی ستادہ مجسم بہ پیش دیدۂ دل | پسر برادرم آن کوچك ندیدہ پدر
کہ در ولایت ہند از عداوت گردون | فتادہ طفل یتیم و غریب و بی مادر

....

سپھر مرتبہ شاھا برب ارض و سما | بشاہ غائب و حاضر خدای جن و بشر
کہ نور چشم من آن کودك یتیم و غریب | کہ دامن دکن از آب چشم او شد تر
بلطف سوی منش کن روان کہ باقی عمر | مرا ببوی برادر چو جان بود در بر
امید دیگرم این است ناامید نیم | کہ تا جھان بود ای خسرو جھان پرور

....

بدفتر کرمت نام این گدا بنگار | بحال محتشَم ای شاہ محتشم بنگر

(۲)

کردم روان بدرگھش از نظم یك گھر | کارایش خزانۂ ھفت آسمان کند
گفتم مگر بہ قیمت آن شاہ تاج بخش | فرق مرا بلند تر از فرقدان کند

....

ناگہ پس از دو سال فرستادۂ فقیر | کایّام روزیش اجل ناگھان کند
آوردہ نقد نقد برادر ولی چہ نقد | نقدی کہ دخل کیسہ زخرجش زیان کند
من مرد کم بضاعت و او طفل پُرھوس | با این دو وضع مرد معیشت چسان کند

....

ادبار بین که بی درمی چون من از عراق — نظمی روان بجانب هندوستان کند

....

وان نظم مدح نکته شناسی بود که او — از بهر نکته دان کف و ول بحر و کان کند

وزرای چاره ساز باندك توجهی — قادر بود که در بدن مرده جان کند

و آنگه کند تغافل و آید رسول من — نوعی که از جفای مقارض فغان کند

خواهد کرایهٔ دوسره یکسر از فقیر — و ز بار قرض پشت فقیرم گران کند

(۳)

هست این قصیدهٔ ثالث که من بهند — با صد هزار گنج دعا کرده ام روان

این بار خود مراد من اندك حمایتی ست — از لطف شه که هست به از گنج شایگان

هم گشته ام باین صله قانع که در دکن — از من قراضهٔ که بود نزد این و آن

گردد بیك اشارهٔ نوّاب کامیاب — واصل بقاصدان من تیره خان و مان

ان اقتباسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محتشم کے ایک بھائی دکن میں رہتے تھے اور وہیں انہوں نے ایک کمسن بچہ چھوڑ کر انتقال کیا، محتشم نے ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر ایک قاصد کے ہاتھ مرتضٰی نظام شاہ بحری کی خدمت میں روانہ کیا، اس قصیدے میں اپنے بھتیجے کو اپنے پاس بھیجنے کی درخواست کی اور دبی زبان سے قصیدے کا صلہ مانگا۔ محتشم کا قاصد دو سال کے بعد اس بچے کو ساتھ لے کر ہندوستان سے واپس آیا۔ مگر صلے کی امید پوری نہ ہوئی، اس پر محتشم نے ایک دوسرا قصیدہ نظام شاہ کے پاس بھیجا، جس میں صلہ نہ ملنے کی شکایت کی اور لکھا کہ میرا بھتیجا میرے پاس پہنچ تو گیا، لیکن اس پر ہوس لڑکے کی وجہ سے مجھ کم بضاعت کے مصارف میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا ہے۔ اور قاصد کے جانے آنے میں جو خرچ ہوا اس نے مجھ کو اور زیر بار کر دیا ہے۔ اس قصیدے کا صلہ بھی شاید کچھ نہیں ملا، محتشم نے ایک مختصر سا قصیدہ اور نظام شاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور لکھا کہ یہ تیسرا قصیدہ بھیج رہا ہوں۔ اس مرتبہ تھوڑی سی

ایک مختصر قطعہ اپنے بھائی عبدالغنی کی وفات پر بھی کہا۔ ہے اس کا پہلا اور آخری شعر درج ذیل ہے:

گل گلشن لطف عبد الغنی   کہ بادش بهشت معلیٰ نصیب
خرد فکر تاریخ وی کرد و گفت   "چه جایی مبارك شد او را نصیب" =۹۵۹ھ(۱)

عبدالغنی کی وفات پر محتشم نے جو ترکیب بند کہا ہے اس کے مندرجہ ذیل شعر اور مصرعے قابل لحاظ ہیں:

چو دیده بررخ عبد الغنی من فگنی   ز روی درد برآر از زبان من فریاد
دلم که می شد از ادراك دوریٔ تو هلاك   تو خود بگو که هلاك تو چون کند ادراك
ز دیدۂ پدر ای یوسف دیار بقا   چرا به مصر فنا بی برادران رفتی
بیا ببین که فلك از غم جوانی تو   چه آتشی زده در خرمن جوانی من
ببین برابری او بحان که تاریخش   بحز "برادر با جان برابر من" نیست =۹۵۹ھ
نبی که گفت شهید است هر که مرد غریب   ترا ثواب شهیدان کربلا بادا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ عبدالغنی نے پردیس میں ۹۵۹ھ میں انتقال کیا۔ اس وقت وہ بھی جوان تھا اور محتشم بھی جوان تھے اور ان کے والد زندہ اور دوسرے بھائی موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالغنی ہی محتشم کے وہ بھائی تھے جن کا انتقال دکن میں ہوا تھا اور جن کی وفات کا ذکر محتشم نے اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے، جو مرتضی نظام شاہ کی مدح میں ہے۔ اس قصیدے کے متعلقہ اشعار اوپر نقل کئے جا چکے ہیں۔

غزلیات محتشم:

کلیات محتشم کا آخری حصہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ عام رواج کے مطابق غزلوں کی ترتیب ردیف

(۱) مادہ تاریخ میں لفظ جایی میں دو "ی" شمار کرنا چاہئے ایک لفظ جای کا جز، دوسری یای تنکیر، ایرانی تلفظ کا مقتضا یہی ہے اور اس طرح یہ دوسرے مادۂ تاریخ یعنی "برادر با جان برابر من" کا ہم عدد ٹھہرتا ہے (۹۵۹ھ) دیکھئے ص ۱۳۹۔

وار ہے۔صرف حرف واو تک ہر ردیف میں غزلیں موجود ہیں۔مگر "ہ" کی ردیف میں صرف چار غزلیں ہیں اور "ی" کی ردیف بالکل غائب ہے۔میرے کتب خانے میں محتشم کے دیوان یعنی مجموعہ غزلیات کا ایک قدیم قلمی نسخہ بھی ہے جس میں "ہ" کی ردیف میں چودہ اور "ی" کی ردیف میں چالیس غزلیں ہیں۔کلیات محتشم کا مطبوعہ نسخہ مکمل کلیات نہیں ہے۔مصنف عالم آرائے عباسی کا یہ قول اس پر صادق نہیں آتا کہ "قصائد مصنوع بسیار و غزل و ترکیب و ترجیع بی شمار دارد".

پروفیسر براؤن نے محتشم کے متعلق لکھا ہے:

In his youth he composed erotic verses , but in later life he seems to have conseerated his genius almost entirely to the service of religion.(1)

یعنی محتشم جوانی میں عشقیہ اشعار کہتے تھے، لیکن اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ملکۂ شاعری کو تقریباً بالکل مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔کلیات محتشم کے مطالعہ سے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی۔محتشم کی مذہبی نظموں کی کل کائنات فقط اتنی ہے۔ایک قصیدہ حمد خدا میں ایک نعت رسول میں، تین قصیدے اور ایک ہفت بند منقبت حضرت علی علیہ السلام میں، ایک مرثیہ مصائب امام حسینؑ میں۔یہ کل سات نظمیں ہوئیں، پانچ قصیدے اور دو ترکیب بند،اس مختصر مقدار کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ محتشم نے زمانہ جوانی کے بعد عمر بھر مذہبی نظموں کے علاوہ گویا کچھ نہیں کہا۔مذہبی نظموں کی اس سے زیادہ مقدار تو شاید اس زمانے کے ہر شاعر کے کلام میں موجود ہے۔

مرثیۂ محتشم:

محتشم کے حال میں بہت طول ہوگیا۔مگر چونکہ اب تک کسی نے ان کا حال تفصیل سے نہیں لکھا

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران، ج ۴،ص ۱۷۲۔

ہے، اس لئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ فارسی مرثیے کی تاریخ میں اس سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مشہور شخصیت کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے جائیں۔

کلیات محتشم کا ایک سرسری خاکہ ابھی پیش کیا جاچکا ہے۔ محتشم نے اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، قصیدوں میں تخیل کے زور دکھائے، مبالغے کے طوفان اٹھائے، غزلوں میں عشق کی بچی داستانیں سنائیں، محبت کی جھوٹی کہانیاں بنائیں۔ مختصر یہ کہ ساری عمر مدحت طرازی اور غزل سرائی میں صرف کردی، اتفاق سے واقعۂ کربلا کے متعلق ایک چھوٹا سا مرثیہ بھی کہہ دیا۔ محتشم کو کیا خبر تھی کہ ان کی عظمت و شہرت کی وسیع و رفیع عمارت اسی مختصر بنیاد پر قائم ہوگی۔

مرثیۂ محتشم پر مشاہیر کی رائیں:

محتشم کا مشہور عالم مرثیہ ایک ترکیب بند نظم ہے، جس میں آٹھ آٹھ شعروں کے بارہ بند ہیں اور اسی سبب سے وہ عام طور پر دوازدہ بند کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ زمانۂ تصنیف سے اس وقت تک اس مرثیے کی شہرت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی ہے۔ ممکن نہیں کہ فارسی مرثیوں کا ذکر آئے اور محتشم کے مرثیے کی طرف ذہن منتقل نہ ہو جائے، ہندوستان میں جب تک مجالس عزا میں مخلوط نظم و نثر پڑھنے کا دستور تھا جس کو روضہ خوانی، کتاب خوانی اور حدیث خوانی کہتے تھے، اس وقت تک نثر کی عبارت کے درمیان میں محتشم کے مرثیے کے بند یا بعض اشعار جگہ جگہ پر شامل کردیئے جاتے تھے۔ مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے جو کتابیں فارسی یا اردو نثر میں لکھی گئی تھیں ان میں محتشم کے مرثیے کے اشعار ضرور ملتے ہیں۔ اب ایک مدت سے کتاب دیکھ کر پڑھنا مجالس عزا میں متروک ہوگیا ہے۔ نئے اور نامی ذاکر سب زبانی تقریر کرتے ہیں۔ اب محتشم کے اشعار مجلسوں میں سنائی نہیں دیتے۔ مگر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان اب بھی محتشم کے نام سے واقف ہیں۔

میں ابھی اوپر کہہ آیا ہوں کہ محتشم کا مرثیہ زمانۂ تصنیف سے اب تک نہایت بلند پایہ نظم سمجھا جاتا ہے۔ اس قول کی تصدیق کے لئے چند معتبر مصنفوں کی رائیں تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کی جاتی

ہیں۔ اسکندر بیگ منشی لکھتا ہے:

"مرثیہ ای بجهت سید الشهدا خامس آل عبا در سلك نظم در آورده۔ ابیات بلند و معانی دقیق در آن مندرج است ، گوشوارهٔ گوش سخن در آن روزگار و تا یوم القرار ازو یادگار است"(۱)

والہ داغستانی کہتا ہے:

مرثیه ای که بجهت سید الشهدا، قرة العیون حیدر و زهرا ، شاه کربلا سلام الله علیهم گفته مشهور و بر السنه عالم مذکور است۔ قبولی که در آن مرثیه است هرگز هیچ نظمی را نصیب نشد. شبهه ای در آن نیست که مرثیه آن مرحوم مقبول جناب رسول مختار و ائمه اطهار صلوات الله علیهم اجمعین شده۔ لهٰذا این قبولیت را بهم رسانیده"(۲)

آذر اصفہانی کا قول ہے:

"مرثیهٔ خوبی در ماتم سید الشهدا حسین بن علی علیهما السلام گفته که در اکثر بلاد اسلام بین الخاص و العام مشهور است".(۳)

آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

"اگرچه موزونان بسیار بمرثیهٔ آنجناب خامهٔ فکر را اشك ریز ساخته اند اما حسن قبولی که اینمرثیه یافت دیگری را نصیب نشد"(۴)

---

(۱) تاریخ عالم آرائے عباسی، مطبوعہ طہران، ص ۱۳۰۔
(۲) تذکرہ ریاض الشعرا قلمی۔
(۳) تذکرہ آتشکدہ، بیان محتشم کاشی۔ (۴) خزانہ عامرہ، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۰۰ء، ص ۴۰۵۔

صاحب شمس الضحیٰ لکھتا ہے:

”مرثیه هائی که مولانا محتشم در مصائب آل عبا گفته مشهور عالم است۔ از ابتدای عالم تا انقراض مثلش کسی نگفته و نخواهد گفت۔ چه بالفرض اگر کسی خون جگر خورد و بگوید باری این قبولیت و تاثیر از کجا خواهد آورد که مرثیه های ملا را در عرب و عجم و هندوستان حاصل شده“(۱)

پروفیسر براؤن کا تبصرہ ہے:

The language is extraordinarily simple and direet devoid of those rhetorical devices and verbal conceits which many Europeans find so irritating and shows true pathos and reliegous feeling. (2)

یعنی اس مرثیے کی زبان غیر معمولی طور پر سادہ وسلیس ہے اور حقیقی درد اور مذہبی احساس کی ترجمانی کرتی ہے اور ان معنوی بدائع اور لفظی صنائع سے معرا ہے جن سے اکثر اہل یورپ کو الجھن ہوتی ہے۔

مرثیہ محتشم کی مقبولیت:

ان تبصروں کے علاوہ محتشم کے مرثیے کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج تک سینکڑوں شاعروں نے اس کے جواب میں مرثیے کہے اور متعدد شعرا نے اس کے اشعار کی تخمیس یا تضمین کی۔

---

(۱) مجموعہ مراثی فارسی مرتبہ تقی علی خان، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۰ء، ص ۳۶۱، ۳۶۲۔

(۲) تاریخ ادبیات ایران، ج ۴، ص ۱۷۳۔

راقم نے ۱۹۳۳ء میں ایران اور عراق کی سیاحت کے دوران میں وہاں کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ متعدد روضوں میں نقرئی ضریحوں پر مرثیہ محتشم کے بعض بند یا شعر مثبت کئے ہوے پائے وہ بند اکثر جگہ لکھا ہوا دیکھا جو اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے'' کشتی شکست خوردۂ طوفان کربلا '' کئی روضوں میں بیلوں پر بھی اس بند کے بعض شعر لکھے ہوئے دیکھے۔ طہران سے چند میل کے فاصلے پر ایک قصبے میں ایک احاطے کے اندر تین امام زادوں کے روضے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام عبدالعظیم ہے اور انہیں کے نام سے وہ قصبہ شہزادہ عبدالعظیم کہلاتا ہے۔ اس احاطے کی دیواروں پر کاشی کاری سے محتشم کا پورا مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ ان باتوں سے بھی اس مرثیے کی عظمت اور مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔

محتشم کے مرثیے کی یہ شہرت دیکھ کر بعض لوگوں نے قیاس کرلیا کہ محتشم ایک باقاعدہ مرثیہ گو شاعر تھا اور بہت سے مرثیے اس کی تصنیف سے ہیں۔ مصنف شمس الضحیٰ کا یہ قول آپ ابھی سن چکے ''مرثیہ ھای کہ مولانا محتشم در مصائب آل عبا گفتہ'' اسی طرح ''مراثی محتشم'' کا ذکر اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ پروفیسر براؤن سا محقق بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے لکھتے ہیں:

"... his elegies (Marathi) on the martyrdom of Husayn and the other imams from which the extracts given in the majmaul Fusaha are chiefly taken"(1)

خاقانی مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو کے ص ۶۰۴، ۶۱۳ ملاحظہ کیجئے۔ خاقانی نے اپنے بیٹے رشید کی وفات پر ایک ترکیب بند مرثیہ کہا ہے۔ اس مرثیے میں اکیس اکیس شعر کے پانچ بند ہیں۔ کاتب نے ہر بند کے عنوان پر کچھ ایسی عبارت لکھ دی ہے کہ ہر بند ایک مستقل نظم معلوم ہونے لگا ہے۔

(۱) تاریخ ادبیات ایران، ج ۴، ص ۲۴۱۔

مرثیه دوازده بند از ملا محتشم کاشی رح

باز این چه شورش است که در خلق عالم است
باز این چه نوحه و چه عزا و چه ماتم است

باز این چه رستخیز عظیم است کز زمین
بی نفخ صور خاسته تا عرش اعظم است

این صبح تیره باز دمید از کجا کزو
کار جهان و خلق جهان جمله درهم است

گویا طلوع می کند از مغرب آفتاب
کاشوب در تمامی ذرات عالم است

گر خوانمش قیامت کبری بعید نیست
این رستخیز عام که نامش محرم است

در بارگاه قدس که جای ملال نیست
سرهای قدسیان همه بر زانوی غم است

جن و ملك بر آدمیان نوحه می کنند
گویا عزای اشرف اولاد آدم است

خورشید آسمان و زمین نور مشرقین
پروردهٔ کنار رسول خداؐ حسینؑ

کشتی شکست خوردهٔ طوفان کربلا
در خاك و خون فتاده به میدان کربلا

گر چشم روزگار برو فاش می گریست
خون می گذشت از سر ایوان کربلا

نگرفت دست دهر گلابی بغیر اشك
زان گل که شد شگفته به بستان کربلا

از آب هم مضائقه کردند کوفیان
خوش داشتند حرمت مهمان کربلا

بودند دیو و دد همه سیراب و می مکید
خاتم ز قحط آب سلیمان کربلا

زان تشنگان هنوز به عَیّوق می رسد
فریاد العطش ز بیابان کربلا

آه از دمی که لشکر اعدا نه کرده شرم
کردند رو به خیمهٔ سلطان کربلا

آن دم فلك بر آتش غیرت سپند شد
کز خوف خصم در حرم افغان بلند شد

کاش آن زمان سرادق گردون نگون شدی | و این خرگهه بلند ستون بی ستون شدی
کاش آن زمان که کشتی آل نبی شکست | عالم تمام غرقهٔ دریای خون شدی
کاش آن زمان ز آه جهان سوز اهلبیت | یك شعله برق خرمن گردون دون شدی
کاش آن زمان بر آمدی از کوه تا به کوه | سیل سیه که روی زمین قیرگون شدی
کاش آن زمان که پیکر او شد درون خاك | جان جهانیان همه از تن برون شدی
کاش آن زمان که این حرکت کرد آسمان | سیماب وار روی زمین بی سکون شدی
این انتقام اگر نه فتادی به روز حشر | با این عمل معاملهٔ دهر چون شدی

آل نبی چو دست تظلّم بر آورند
ارکان عرش را به تزلزل در آورند

بر خوان غم چو عالمیان را صلا زدند | اول صلا به سلسلهٔ انبیا زدند
نوبت به اولیا چو رسید آسمان تپید | ز آن ضربتی که بر سر شیر خدا زدند
پس آتشی ز اخگر الماس ریزه ها | افروختند و در حسن مجتبا زدند
وانگه سرا دقی که ملك محرمش نه بود | کندند از مدینه و در کربلا زدند
و زتیشهٔ ستیزه در آن دشت کوفیان | بس نخلها ز گلشن آل عبا زدند
پس ضربتی کز آن جگر مصطفی درید | بر حلق تشنهٔ خلف مرتضا زدند
اهل حرم دریده گریبان کشاده موی | فریاد بر در حرم کبریا زدند

روح الامین نهاده به زانو سر حجاب
تاریك شد زدیدن آن چشم آفتاب

چون خون ز حلق تشنهٔ او بر زمین رسید | جوش از زمین به ذروهٔ عرش برین رسید
نزدیك شد که خانهٔ ایمان شود خراب | از بس شکستها که به ارکان دین رسید
نخل بلند او چو خسان بر زمین زدند | طوفان به آسمان ز غبار زمین رسید

باد آن غبار چون به قرار نبی رساند — گرد از مدینه بر فلك هفتمین رسید
یکباره جامه در خم گردون به نیل زد — چون این خبر به عیسیٔ گردون نشین رسید
پر شد فلك ز غلغله چون نوبت خروش — از انبیا به حضرت روح الامین رسید
کرد این خیال وهم غلط کارکان غبار — تا دامن جلال جهان آفرین رسید

هست از ملال گرچه بری ذات ذو الجلال
او در دل است و هیچ دلی نیست بی ملال

ترسم جزای قاتل او چون رقم زنند — یکباره بر جریدهٔ رحمت قلم زنند
ترسم کز این گناه شفیعان روز حشر — دارند شرم کز گهنه خلق دم زنند
دست عتاب حق بدر آید ز آستین — چون اهل بیت دست بر اهل ستم زنند
آه از دمی که با کفن خون چکان ز خاك — آل نبی چو شعلهٔ آتش علم زنند
فریاد از آن زمان که جوانان اهلبیت — گلگون کفن به عرصهٔ محشر قدم زنند
جمعی که زد بهم صف شان شور کربلا — در حشر صف زنان صف محشر بهم زنند
از صاحب حرم چه توقع کنند باز — آن ناکسان که تیغ به صید حرم زنند

پس برسنان کنند سری را که جبرئیل
شوید غبار گیسویش از آب سلسبیل

روزی که شد به نیزه سر آن بزرگوار — خورشید سر برهنه بر آمد ز کوهسار
موجی به جنبش آمد و برخاست کوه کوه — ابری به بارش آمد و بگریست زار زار
گفتی تمام زلزله شد خاك مطمئن — گفتی فتاد از حرکت چرخ بی قرار
عرش آن زمان به لرزه در آمد که چرخ پیر — افتاد در گمان که قیامت شد آشکار
آن خیمهٔ که گیسوی حورش طناب بود — شد سرنگون زباد مخالف حباب وار
جمعی که پاس محمل شان داشت جبرئیل — گشتند بی عماری و محمل شتر سوار

با آن که سر زد این عمل از امت نبی　　روح الامین ز روی نبی گشت شرمسار

وانگه ز کوفه خیل الم رو به شام کرد

نوعی که عقل گفت قیامت قیام کرد

بر حرب گاه چون ره آن کاروان فتاد　　شور نشور واهمه را در گمان فتاد

هم بانگ نوحه غلغله در شش جهت فگند　　هم گریه بر ملائك هفت آسمان فتاد

هر جا که بود آهوئی از دشت پا کشید　　هر جا بود طائری از آشیان فتاد

شد وحشتی که شور قیامت به باد رفت　　چون چشم اهلبیت بر آن کشتگان فتاد

هر چند بر تن شهداء چشم کار کرد　　بر زخم های کاری تیغ و سنان فتاد

ناگاه چشم دختر زهرا در آن میان　　بر پیکر شریف امام زمان فتاد

بی اختیار نعرهٔ "هذا حسین" از او　　سر زد چنان که آتش از ان در جهان فتاد

پس بازبان پر گله آن بضعة البتول

رو در مدینه کرد که یا ایها الرّسول

این کشتهٔ فتاده به هامون حسین تست　　و این صید دست و پا زده در خون حسین تست

این نخل تر کز آتش جان سوز تشنگی　　دود از زمین رسانده به گردون حسین تست

این ماهی فتاده به دریای خون که هست　　زخم از ستاده بر تنش افزون حسین تست

این خشك لب فتادهٔ ممنوع از فرات　　کز خون او زمین شد جیحون حسین تست

این غرقهٔ محیط شهادت که روی دشت　　از موج خونِ او شده گلگون حسین تست

این شاه کم سپاه که با خیل اشك و آه　　خرگاه ازین جهان زده بیرون حسین تست

این قالب تپان که حسین مانده بر زمین　　شاه شهید نا شده مدفون حسین تست

پس روی در بقیع به زهرا خطاب کرد

وحش زمین و مرغ هوا را کباب کرد

کای مونس شکسته دلال حال ما به بین　　ما را غریب و بیکس و بی آشنا به بین
اولاد خویش را که شفیعان محشر اند　　در ورطهٔ عقوبت از اهل جفا به بین
در خلد بر حجاب دو کون آستین فشا ن　　و اندر جهان مصیبت ما برملا به بین
نی نی در آچو ابر خروشان به کربلا　　طغیان موج فتنه و سیل بلا به بین
تن های کشتگان همه در خاك و خون نگر　　سرهائی سروران همه بر نیزه ها به بین
آن سر که بود بر سر دوش نبی مدام　　یك نیزه اش زدوش مخالف جدا به بین
وان تن که بود پرورشش در کنار تو　　غلطان بخاك معرکهٔ کربلا به بین

یا بضعة الرسول ز ابن زیاد داد
کاو خاك اهل بیت رسالت به باد داد

ای چرخ غافلی که چه بیداد کرده ای　　وز کین چها درین ستم آباد کرده ای
این ملعنت بس است که عترت رسول　　بیداد کرد خصم و تو امداد کرده ای
ای زادهٔ زیاد نه کرده است هیچ گهه　　نمرود این عمل که تو شدّاد کرده ای
کام یزید دادهٔ از کشتن حسینؑ　　بنگر کرا به قتل که دل شاد کرده ای
بهر خسی که بار درخت شقاوت است　　در باغ دین چه با گل و شمشاد کرده ای
حلقی که سود لعل لب خود نبی بر آن　　آزرده اش زخنجر فولاد کرده ای
با دشمنان دین نه توان کرد آنچه تو　　با مصطفیٰ و حیدر و اولاد کرده ای

ترسم ترا دمی که به محشر در آورند
از آتش تو دود ز محشر بر آورند

خاموش محتشمؒ که دل سنگ آب شد　　بنیاد صبر و خانهٔ طاقت خراب شد
خاموش محتشمؒ که ازین حرف سوز ناك　　مرغ هوا و ماهی دریا کباب شد
خاموش محتشمؒ که ازین نظم گریه خیر　　روی زمین زاشك جگر گون خضاب شد

خلوش محتشمؔ کہ فلک بسکہ خون گریست | دریا ھزار مرتبہ گلگون حباب شد

خاموش محتشمؔ کہ ز سوز تو آفتاب | از آہ سرد ماتمیان ماھتاب شد

خاموش محتشمؔ کہ ز ذکر غم حسین | جبریل را ز روی پیمبر حجاب شد

خلوش محتشمؔ کہ ازین شعر خون چکان | در دیدہ اشك مستمعان خون ناب شد

تا چرخ سفلہ بود خطائی چنین نہ کرد

بر ھیچ آفریدہ جفائی چنین نہ کرد

مرثیہ محتشم کی شان نزول:

اس مرثیے کی شان نزول یہ بیان کی جاتی ہے کہ محتشم نے اپنے بیٹے کی وفات پر ایک مرثیہ کہا، جس میں یہ دو شعر بھی ہیں:

روا بود کہ تو در زیر خاك باشی و من | سیاہ پوشم و بر سر کنم ز ماتم خاك

چرا تو جامہ نکردی سیاہ در غم من | چرا تو خاك نکردی بسر ز ماتم من(۱)

یہ مرثیہ کہنے کے بعد ایک رات کو محتشم نے خواب میں حضرت علیؑ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں:

''اے محتشم تم نے اپنے بیٹے کا تو مرثیہ کہا، میرے فرزند کا مرثیہ کیوں نہ کہا''۔ دوسری رات کو پھر خواب میں دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میرے فرزند حسین کا مرثیہ کہو۔ محتشم نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہوں کیا کہوں؟ فرمایا: کہو'' باز این چہ شورش است کہ در خالق عالم است'' جب محتشم کی آنکھ کھلی تو یہ مصرع یاد تھا اسی وقت اسی بحر میں مرثیہ کہنا شروع کر دیا۔(۲) اس بیان میں تذکرہ مخزن الغرائب اور ریاض الشعرا دونوں متفق ہیں۔ موخر الذکر نے اس پر اتنا اور اضافہ

---

(۱) جس مرثیے کے یہ دو شعر ہیں وہ محتشم نے اپنے بیٹے کی وفات پر نہیں بلکہ اپنے بھائی عبدالغنی کی وفات پر کہا تھا، اس مرثیے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے دیکھئے صفحہ ۱۳۵، یہ اس کے دوسرے بند کے آخری دو شعر ہیں۔

(۲) مجموعہ مراثی فارسی، مرتبہ تقی علی خان، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۰ء، ص ۳۶۰، ۳۶۱۔

کیا ہے کہ مرثیہ کہتے کہتے محتشم جب اس مصرع پر پہنچے "هست از ملال گرچه بری ذات ذو الجلال" تو دوسرا مصرع نہ کہہ سکے، کئی دن گذر گئے مگر مصرع نہ ہوا، آخر ایک رات کو دیکھا کہ امام عصر تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں یہ مصرع لگالو" او در دل است و هیچ دلی نیست بی ملال"۔

ان اعتقادی روایتوں کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کی ہم کو ضرورت نہیں۔ ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ لوگ ایسا بلند پایہ اور مقبول عام مرثیہ کہنا بغیر کسی غیبی امداد کے معمولی انسان کا کام نہیں سمجھتے تھے۔

مرثیہ محتشم کے جوابات:

تاریخ عالم آرائے عباسی کے مصنف نے محتشم کے مرثیے کے متعلق جو رائے ظاہر کی وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مرثیہ محتشم کی زندگی ہی میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اور اس درجے کا قرار دیا جا چکا تھا کہ قیامت تک اپنے مصنف کا نام باقی رکھے گا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح مورخ مذکور کے قول کے مطابق ملا محتشم کے ہفت بند کے جواب میں ان کے پچاس ساٹھ ہمعصروں نے ہفت بند کہے تھے، اسی طرح محتشم کے زمانے ہی میں ان کے مرثیے کے جواب میں بھی بہت سے مرثیے کہے گئے ہوں گے۔ نصیبی نے مرثیہ محتشم کو مخمس کیا ہے اور اس کے متعلق ایک تحریر لکھی ہے۔ وہ تحریر فارسی واقعات و مراثی کے مجموعے کے آخر میں نقل کر دی گئی ہے۔

محتشم کے بعد بھی بہت سے ایرانی اور ہندوستانی شعرا نے اس غیر فانی مرثیے کے جواب میں مرثیے کہے ہیں۔ اس طرح کے جو مرثیے اس وقت میرے سامنے موجود ہیں ان کے مصنفوں کے نام یہ ہیں۔ نصیبی کرمانشاہانی، حبیب کردستانی، جودی خراسانی، خاکی شیرازی، وصال شیرازی، وقار شیرازی، سرباز ایرانی۔ ان جواب لکھنے والوں نے اپنا پورا زور طبع صرف کر دیا۔ مگر محتشم کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور ان میں سے کسی کے مرثیے کو کوئی خاص شہرت حاصل نہ ہوئی۔ جوابی مرثیوں کے علاوہ

ایسے مرثیے تعداد میں بہت زیادہ ہیں جو محتشم کے طرز میں کہے گئے ہیں اور جن پر محتشم کا اثر نمایاں ہے۔ مولوی سید علی نقی صاحب مجتہد مرحوم کے قلمی کشکول میں ایک عربی مرثیہ ہے جو مرثیہ محتشم کے طرز میں کہا گیا ہے (ورق ۱۱۰) کشکول حکیم سید علی صاحب، آشفتہ مرحوم کے پاس تھا۔

محتشم کاشی اور ملا کاشی:

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ بعض مستند اور معتبر مصنفین کو محتشم کے ہفت بند اور مرثیے میں التباس اقع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض لوگ حسن کاشی کے مشہور ہفت بند کو محتشم کاشی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس ہفت بند کا مصنف ملا کاشی کے نام سے مشہور ہے جس سے مراد بلاشبہ ملا حسن کاشی ہیں۔ مگر حسن کا حال کیسا ان کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ برخلاف اس کے محتشم کا نام نہایت مشہور ہے جو ملا بھی تھے اور کاشی بھی تھے۔ ان حالات میں ملا کاشی کے لفظ سے محتشم کی طرف ذہن کا منتقل ہو جانا بالکل فطری ہے۔ اس غلط فہمی کے استیصال کی غرض سے حسن کاشی کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔ (۱)

ملا حسن کاشی:

ملا حسن کاشی خطۂ مازندران کے شہر آمل میں پیدا ہوئے اور زندگی کا زیادہ حصہ مازندران ہی میں گزرا لیکن آبائی وطن کاشان تھا اسی کی نسبت سے انہوں نے اپنا تخلص کاشی رکھا۔ کبھی کبھی حسنؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ ملا کاشی نے اپنے قصیدوں میں اپنے وطن کا ذکر بار بار کیا ہے۔

مسکن کاشی اگر در خطۂ آمل بود		لیکن از جد و پدر نسبت بہ کاشان میرود (۲)

---

(۱) حسن کاشی کے حالات تذکرہ دولت شاہ سے لئے گئے ہیں اور ان کے اشعار مجالس المومنین سے نقل کیے گئے ہیں۔

(۲) حسن کاشی کے حالات کے سلسلے میں یہ شعر یونہی لکھا گیا ہے مگر ان کے کلام کا جو انتخاب مجالس المومنین میں دیا گیا ہے اس میں یہ شعر یوں ملتا ہے:

مولد من آمل و آبشخورم مازندران		از رہ جد و پدر نسبت بہ کاشان میرود

گرنه خوردی آدم آن یکدانه گندم در بهشت　　کی بُدی در خاك آمل مولد و منشای من



بندهٔ بیچاره کاشیؔ از دل و جان سال و ماه　　روز و شب در خطهٔ آمل ثنا خوان شما است

ذیل کے شعروں میں اپنے وطن اور مسکن کے علاوہ نام اور تخلص بھی بتایا ہے:

کاشیؔ اصلم آملی مولد حسن نامی که هست　　همچو حسّان روز احسان صدر جنت جای من

کمترین مملوك حیدر کاشیؔ ام کز فضل او　　در سخن بالاتر از عیسی ست استعلای من

مولانا کاشی فاضل و عاقل، خوبصورت اور نیک سیرت تھے۔ امیروں اور بادشاہوں کی مدح نہ کرتے تھے اور مناقب ائمہ کے سوا کچھ نہ کہتے تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنے کئی قصیدوں میں کیا ہے۔ ذیل میں دو قصیدوں کے اقتباس درج کئے جاتے ہیں:

من غلام حیدرؑ و آنگاه مدّاحی غیر　　خواجگان حشر کی معذور دارندم در این

آن حسنؔ نامم که اندر مدح داماد نبیؐ　　می کند بر طبع پاکم روح حسّان آفرین



منم که یرلغ طبعم بدار ملك بقا　　نوشته اند بمدّاحی محمدؐ و آل

درون مدت سی سال کسی نداد نشان　　که بوده ام به سخن پیش کس مدیح سگال

مخدرات سرا پردهٔ ضمیر مرا　　بمدح آل علیؑ بسته اند عقد وصال

بروضهٔ دل کاشی ثنای شان خوانند　　هر آن شگوفه که سر برزند ز شاخ خیال

ان اشعار میں کاشیؔ کہتے ہیں کہ میں نے تیس برس سے محمد و آل محمدؐ کے سوا کسی کی مدح نہیں کی ہے۔ یہی بات ذیل کے شعر میں بھی کہی ہے:

قریب سی سال شد که خاطر من　　هست در راه دین ثنا گستر

اس شعر میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

قرب سی سال است افزون کاجر مستوفای من　　در کف سلطان دین ساقی کوثر کرده اند

تذکرہ دولت شاہ کی روایت کے مطابق ملا کاشی حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر نجف اشرف گئے اور روضۂ حضرت علیؑ میں وہ قصیدۂ منقبت پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:

ای بدو آفرینش پیشوای اهل دین　　　　وی ز عزت مادح بازوی تو روح الامین

اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: اے کاشیؒ تو دور دراز سے آیا ہے۔ مجھ پر تیرے دو حق ہیں۔ ایک مہمانی کا دوسرا صلۂ شعر کا۔ تو بصرہ چلا جاو وہاں ایک تاجر ہے مسعود بن افلح۔ اس کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ ایک سال عمان کے سفر میں تیرا جہاز غرق ہونے کو تھا۔ تو نے مجھ سے مدد مانگی اور ایک ہزار دینار میرے لئے نذر کئے، میں نے تیری مدد کی اور تیرا جہاز مع کل سامان کے بحفاظت ساحل پر پہنچا دیا۔ اب وہ نذر پوری کر اور وہ رقم کاشیؒ کو دیدے۔ ملا کاشیؒ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس تاجر نے ایک ہزار دینار اور ایک خلعت ملاؔ کو دیا اور اپنی نذر مقبول ہونے کی خوشی میں فقرا اور صلحا کی دعوت کی۔

ذیل میں چند قصیدوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا کاشیؒ تنگدستی کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھاتے تھے، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے۔ محبت ائمہ کی دولت جو انہیں حاصل تھی، اس کو دولت دنیا کا نعم البدل سمجھتے تھے۔ چونکہ کسی کی مدح نہ کرتے تھے اس لئے کسی سے صلے کی توقع بھی نہ رکھتے تھے۔ اور جو کچھ انہیں مل جاتا تھا اسے جناب امیرؑ کا عطیہ سمجھتے تھے:

گدای کوی آن شاهم که در کوی گدایانش　　　　سلیمان با همه حشمت ندارد پایۂ سلمان

مرا گر ثروت دنیا نه باشد غم چرا باشد　　　　که بهتر بود این دنیا نخواهد بود جز حرمان



کربلای من شد آمل ز آنکه نان من در او　　　　تنگ تر ز آب است کان بر آل حیدرؑ کرده اند

غم زدرویشی چه دارم ز آنکه می دانم یقین　　　　عزتی کز فقر با سلمان و بوذر کرده اند

قرب سی سال است افزون کاجر مستوفای من　　　　در کف سلطان دین ساقی کوثر کرده اند

آن تونگر همتم در دین که با افراط فقر　　　　ظاهر است از خلق عالم فرط استغنای من

محنت دل با که گویم ز آنکه در مازندران　　نیست کس را از بلای خویشتن پروای من

تا نه ریزد آبرویم پیش هر کس بهر نان　　قفل خاموشی است دائم بر لب گویای من

غم ز درویشی ندارم چونکه می دانم که هست　　در کفِ سالارِ محشر مایۀ اشرای من

در ضیافت خانۀ تحقیق خوان سالار خلد　　می کند اجری ز دست میر دین اجرای من

مناجاتوں اور منقبتوں کا ایک مجموعہ ذخیرۂ مناقب کے نام سے مطبع یوسفی دہلی نے ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں شائع کیا۔ اس میں حسن کاشانی کا ایک قصیدہ اور ایک مخمس بھی ہے۔ قصیدے کے مطلع میں شاعر عہد کرتا ہے کہ زندگی بھر حضرت علی علیہ السلام کی مدح کے سوا کچھ نہ کہے گا اور مقطع میں اپنے وطن کا پتا بتاتا ہے۔ یہ دونوں شعر نقل کئے جاتے ہیں:

دلا تا در جهان باشم به امر خالق اکبر　　نه گردانم زبان را جز به مدح خواجۂ قنبر

حسنؔ مدّاح خوش خوانم محبّ آل عمرانم　　ز نفس شهر کاشانم ز امر ایزدِ داور

مخمس میں حسنؔ غربت کے عالم میں بیماری اور پریشاں روزگاری سے نجات پانے کے لئے حضرت علیؑ سے امداد کی درخواست کرتے ہیں۔

دولت شاہ کا بیان ہے کہ ملا حسن کاشی نے جوانی میں انتقال کیا اور عراق کے شہر سلطانیہ میں دفن ہوئے قاضی نور اللہ شوشتری لکھتے ہیں کہ مولانا حسنؔ کی قبر شہر سلطانیہ میں جانب قبلہ واقع ہے۔ بادشاہ صاحبقران مغفور کے حکم سے اس پر ایک عمارت بنادی گئی ہے اور باغ لگا دیا گیا ہے۔ اس وقت وہ قبر اس دیار کے باشندوں کی زیارت گاہ ہے۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ملا کاشی کا سن وفات معلوم نہیں، مگر وہ سلطان محمد خدا بندہ کے زمانے میں تھے۔ اس نام کے دو مشہور بادشاہ ایران میں گزرے ہیں، ایک تاتاری خاندان کا دوسرا صفوی خاندان کا۔ تذکرۂ دولت شاہ عہد صفوی کے آغاز سے پہلے ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں تصنیف ہوا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ دولت شاہ کی مراد تاتاری خاندان کا وہ بادشاہ ہے جس کا تاتاری نام اولجائتو خربندہ

اور اسلامی نام محمد خدابندہ تھا۔ اس بادشاہ کا عہد سلطنت ۷۰۵ھ۔۷۱۶ھ (۱۳۰۵ء۔۱۳۱۶ء) ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملا حسن کاشی ملا محتشم کاشی سے کوئی ڈھائی سو برس پہلے گذرے ہیں۔

ہفت بند کاشی اور اس کے جوابات:

دولت شاہ نے ملا حسن کاشی کے نام کے ساتھ افضل المتکلمین لکھا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ان کے کلام میں جو متانت اور لطافت ہے وہ کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ہے۔ مناقب میں ان کے قصیدے مشہور ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں تحریر فرماتے ہیں:

''از جملہ قصائد بی مانند او قصیدہ ایست هفت بند کہ اکثر استادان متاخرین در تتبع آن دُرها سفته اند و به آن لطافت تا غایت چیزی نگفته اند''

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مجالس المومنین کی تصنیف کے وقت تک یعنی ملا حسن کاشی کے انتقال کے تین سو برس بعد تک نامی شعرا ان کے ہفت بند کا جواب کہا کرتے تھے۔ اس کوشش میں انہوں نے اچھی اچھی نظمیں کہیں، مگر نظم ہفت بند کاشی کو نہ پہنچ سکی۔ (۱)

---

(۱) محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد میں کپتان ظفر الدولہ معظم الملک فتح علی خان بہادر ہیبت جنگ نے ایک مسئلے میں جناب امیر سے مدد چاہی، ان کی بیوی نے اسی رات کو ایک خواب دیکھا جس سے وہ مسئلہ حل ہوگیا۔ یہ واقعہ ۲۵/ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ کا ہے۔ کپتان موصوف نے اس واقعے کی یادگار کے طور پر مجموعۂ ہفت بند چھپوا کر وقف کر دیا۔ اس مجموعے میں مختلف شاعروں کے چودہ ہفت بند اور ہفت بند کاشی کے دو مخمس مجموعاً سولہ نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ عمدہ مضبوط کاغذ پر بہت خوش خط محمد حسین کے اہتمام میں ۱۲۵۸ھ میں چھپا اور بلا قیمت تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے سرورق پر یہ چار شعر درج ہیں۔

آن جان پاک دین ظفر الدولہ کہ هست — جاه و جلال و دولت و حشمت بکام او
درشکر این کہ از شہ مردان بوقت خواب — شد فیض عام خاص معین بہ نام او
این هفت بند طبع نمود از برای وقف — ہر خاص بهره تا برد از لطف عام او
اظهر بہ وقت طبع خوش این مصرعہ نوشت — ''شد وقف هفت بند قبول امام او'' = ۱۲۵۸ھ

اس مجموعے کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

ہفت بند محتشم:

ہفت بند کاشی کے جواب میں ملا محتشم نے بھی ایک ہفت بند کہا تھا جس کو بعض مصنفین نے مرثیہ محتشم سمجھ لیا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ ملا کاشی کا ہفت بند حضرت علیؑ کی مدح میں ہے اور اس کی تمام جوابی نظموں کی طرح محتشم کے ہفت بند کا موضوع بھی حضرت علیؑ کی مدح ہے۔ ذیل میں حسن کاشی اور محتشم کاشی دونوں کے ہفت بندوں کا ایک ایک بند نقل کیا جاتا ہے:

از ملا حسن کاشی:

السلام ای سایه ات خورشید رب العالمین	آسمان عز و تمکین آفتاب داد و دین
مفتی هر چار دفتر ، خواجهٔ هر هشت خلد	داور هر شش جهت ، اعظم امیر المومنین
عالم علم لدنّی شهسوار تو کُشِف	ناصر دین ، نفس پیغمبر ، امام المتقین
صورت معنی فطرت ، باعث ایجاد خلق	بهترین نسل آدم، نفس خیر المرسلین
صاحب یوفون بالنذر ، آفتاب اِنّما	قرة العین لعمرك ، نازش روح الامین
مقصد تنزیل بلّغ، مظهر اسرارِ غیب	مطلع تیلوه شاهد ، مقطع حبل المتین
ناشنیده از زمان مهد تا پایان عمر	بی رضای حق ز تو حرفی کرام کاتبین
کاتب دیوان امرت موسی دریا شگاف	پرده دار بام قصرت عیسی گردون نشین
از عطای دست فیاض تو دریا مستفیض	و ز ریاض نزهت طبع تو رضوان خوشه چین
نقش بند کاف و نون از بدو فطرت تاکنون	تا کشیده چون مه رخسار تو نقش مبین
در جهان از روی حشمت چون جهلی در جهان	بر زمین از روی رفعت آسمانی بر زمین
مثل تو چون شبه ایزد در همه عالم محال	وربود ممکن نه اِلّا رحمة اللعالمین

آنکه مداحش خدا همدم رسول الله بود

گر کسی همتاش باشد هم رسول الله بود

از ملا محتشم کاشی:

السلام ای عالم اسرار ربّ العالمین — وارث علم پیمبر فارس میدان دین

السلام ای بارگاهت خلق را دار السلام — آستان رویت بطرف آستین روح الامین

السلام ای پیکر زائر نوازت زیر خاك — از پی جنت خریدن خلق را گنج زمین

السلام ای آهن دیوار تیغت آمده — قبلهٔ اسلام را از چار حد حصن حصین

السلام ای نائب پیغمبر آخر الزمان — مقتدای اولین و پیشوای آخرین

شاه خیبر گیر، اژدر در، امام بحر و بَر — ناصر حق ، غالب مطلق، امیر المومنین

ملك دین دین را پادشاه از نصب سلطان رسل — مصطفیٰ را جانشین از نصّ قرآن مبین

بازوی عونت رسول اللّٰه را ارکن ظفر — رشتهٔ مهرت رجال اللّٰه را حبل المتین

هر که در باب تو خواند فصلی از فضل کلام — در مکان مصطفی داند بلا فصلت مکین

بو ترابت تا لقب گردیده، دارد آسمان — چون یتیمان گرد غم بر چهره از رشك زمین

مایهٔ تخمیر آدم گشت نور پاك تو — ورنه کی می بست صورت امتزاج ماء و طین

آنکه خاتم را ید اللّٰه کرد در انگشت تو — ساخت نصّ فوق ایدیهم ترا نقش نگین

چون ید اللّٰهی که ابن عم رسول اللّٰه بود — ایزدت جا داده بالا دست هر بالا نشین

آن ید اللّٰه را که ابن عم رسول اللّٰه بود

گر کسی همتاش باشد هم رسول اللّٰه بود(۱)

اسی ایک ایک بند کے مقابلے سے ان دونوں نظموں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ محتشم کا ہفت بند بھی ایک بلند پایہ نظم ہے، مگر جو رفعت ، جزالت اور معنویت کاشی کے کلام میں ہے وہ محتشم کے یہاں کہاں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ایران کی مذہبی شاعری کے دونوں شعبوں یعنی مناقب ائمہ اور

---

(۱) محتشم کے ہفت بند کا جو بند اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے آخری دو شعروں کا پہلا مصرع تقریباً ایک ہی ہے یہ کتابت کی غلطی ہے۔ مگر اس ہفت بند کا کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہیں ہوا اس لئے اس غلطی کی تصحیح نہ ہو سکی۔

مصائب ائمہ میں کاشان ہی کے ایک ایک شاعر نے بلند ترین منزلت اور لازوال شہرت حاصل کی۔ بلا مبالغہ سینکڑوں شاعروں نے اپنا پورا زور طبع صرف کر دیا۔ لیکن نہ حسن کاشی کے ہفت بند کا جواب ہوسکا، نہ محتشم کاشی کے مرثیے کا۔

محتشم اور آذری سے پہلے کا ایک ترکیب بند مرثیہ:

محتشم اور آذری کے مرثیوں کے متعلق میرا ایک قیاس ہے جس کو بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فخر الدین علاء الدولہ عرب شاہ رئیس ہمدان کو آخری سلجوقی بادشاہ طغرل بن ارسلان نے قتل کروادیا۔ سلجوقی خاندان کی تاریخ راحت الصدور کے مصنف محمد بن علی بن سلیمان راوندی نے مقتول کا مرثیہ کہا جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب ۵۹۹ھ میں تالیف ہوئی تھی۔ راوندی کا مرثیہ ترکیب بند ہے۔(۱) اس کا پہلا بند یہ ہے:

آه این چه محنت است که اندر جهان فتاد — آه این چه واقعه ست که از ناگهان فتاد

این دیده چیست گوئی کزدیده خون بریخت — وین غصه از چه در دل پیرو جوان فتاد

خورشید تیره گشت همش محنتی رسید — مه زرد روئی گشت و چنین ناتوان فتاد

بر جان مصیبتی است که دل را کباب کرد — بر دل هم از غمیست که چندین فغان فتاد

دانی ز چیست این همه آوازهٔ بدست — کز رفتن عرب شه شاه زمان فتاد

ای دیده خون گری که شه فخر دین نماند

آن سرور زمانه و شاه زمین نماند

تیسرے بند کی آخری بیت یہ ہے:

نور دو چشم حیدرؑ و سردار اهلبیت

خورشید فاطمهؑ سرو سالار اهلبیت

---

(۱) دیکھو کتاب راحت الصدور مطبوعہ ہالینڈ ۱۹۲۱ء، ص ۳۵۲، ۳۵۵۔

چوتھے بند کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

ای چرخ دون زال پیمبر چه خواستی و ز خاندان حیدرؑ صفدر چه خواستی

در کربلا بکین بکشودی تو بر حسینؑ او را گرفته بودی و دیگر چه خواستی

راوندیؔ، آذریؔ اور محتشمؔ تینوں کے مرثیے ترکیب بند ہیں۔ تینوں کی بحر ایک ہے۔ راوندیؔ کے پہلے بند اور محتشمؔ کے آٹھویں بند کا قافیہ اور ردیف یکساں ہے۔ راوندیؔ اور محتشمؔ کے مطلع ایک ہی انداز کے ہیں۔ راوندیؔ کے مرثیے میں واقعہ کربلا اور شہادت امام حسینؑ کا ذکر بھی ہے۔ ان سب باتوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آذریؔ نے راوندیؔ کے مرثیے کو اور محتشمؔ نے آذریؔ کے مرثیے کو اپنے لئے نمونہ قرار دیا ہے۔

ملا مقبلؔ اصفہانی:

محتشمؔ کے بعد ایران میں جس شاعر نے مرثیہ گوئی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ ملا مقبلؔ ہیں۔ تعجب ہے کہ ان کے مرثیے جس قدر مشہور ہیں اسی قدر ان کے حالات مستور ہیں۔ تاریخ ادبیات ایران کے زبردست ماہر پروفیسر براؤن نے بھی حالات مقبلؔ سے کامل ناواقفیت کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

فارسی شعرا کے جتنے تذکرے مجھے دستیاب ہوئے ان میں سے کسی میں مقبلؔ کا حال درج نہیں ہے۔ تذکرہ خزانۂ عامرہ میں محمد افضل ثابتؔ الہ آبادی کے حال میں ضمناً مقبلؔ کا ذکر آ گیا ہے۔ مصنف تذکرہ نے لکھا ہے کہ ثابتؔ الہ آبادی نے ''مقبل صفاہانی'' کے مشہور واقعات کے طرز میں واقعات کربلا نظم کئے ہیں۔ اسی سلسلے میں مقبل کے متعلق بھی اتنا لکھ دیا ہے کہ:

"مقبل در عهد سلطان میرزای صفوی اعتباری داشت و در فترت افاغنه متواری بسر میس برد و در عصر نادر شاه به هند آمد و در گجرات نزد مومن خان ناظم آنجا

(۱) تاریخ ادبیات ایران بزبان انگریزی، جلد چہارم، ص ۱۹۳۔

می گزرانید، و همو نجا در سنه سبع و خمسین و مایة و الف در گذشت".(۱)

یعنی مقبل سلطان حسین میرزا صفوی کے عہد میں باعزت تھے۔ افغانوں کے عارضی تسلط کے زمانے میں پوشیدہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے۔ نادر شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور گجرات کے ناظم مومن خان کے پاس رہنے لگے اور وہیں ۱۱۵۷ھ میں انتقال کیا اور کتاب حزن المومنین میں لکھا ہے کہ ملا مقبل کا نام محمد شیخا تھا۔ وہ عنفوان شباب میں بڑے ظریف آدمی تھے۔ ایک مرتبہ محرم کے زمانے میں ایک گروہ عزائے امام حسینؑ میں روتا اور ماتم کرتا ہوا نکلا، ملا بھی اس جماعت میں شامل ہو گیا اور تمسخر کی راہ سے ایک نظم پڑھی، جس سے اس گروہ کے لوگوں کا دل دکھا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ملا مرض جذام میں مبتلا ہو گیا اور یہ حالت ہوگئی کہ لوگ اس کی قربت سے پرہیز کرنے لگے۔ وہ لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہنے کے لئے ایک حمام کی بھٹی میں پڑا رہتا تھا۔ ایک دن ایک خرابے میں دل شکستہ بیٹھا ہوا تھا کہ شیعوں کا ایک گروہ ماتم کرتا ہوا اور یہ نوحہ پڑھتا ہوا گزرا۔

چہ کربلاست امروز چہ پُر بلاست امروز

سر حسینؑ مظلوم از تن جداست امروز

ملّا یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور رویا اور اسی وقت یہ نوحہ کہا:

روز عزاست امروز جان در بلاست امروز

افغان و شورِ محشر در کربلاست امروز

مقبل اصفہانی کا ایک نتیجہ خیز خواب:

اسی رات کو پیغمبرِ خدا کو خواب میں دیکھا کہ ملّا پر بڑی نوازش فرمائی، اس کا قصور معاف کیا اور مقبل کا خطاب عنایت فرمایا۔ اس دن سے مقبل نے واقعات کربلا لکھنا شروع کر دیا۔ اسی کتاب میں

---

(۱) خزانۂ عامرہ، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۰۰ء، ص ۴۲۳۔

مقبل کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ میں نے واقعۂ شہادت امام حسینؑ شب جمعہ میں تمام کیا۔ اور اس کو پڑھا پڑھ کر خوب رویا۔ روتے روتے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ میں روضۂ امام حسینؑ میں ہوں۔ حضرت رسول اکرم بھی تشریف فرما ہیں۔ آپ نے محتشم سے فرمایا کہ یہ شب جمعہ ہے تم منبر پر جاؤ اور مصائب حسینؑ بیان کرو۔ محتشم نے تعمیل حکم کی اور اپنے مشہور مرثیے کے چند شعر پڑھے۔ جب محتشم مرثیہ پڑھ چکے تو حضرتؐ نے ان کو ایک خلعت عطا فرمایا۔ یہ دیکھ کر مجھ کو افسوس ہوا کہ شاید میرے اشعار حضرتؐ نے قبول نہیں فرمائے ورنہ میری طرف بھی التفات فرماتے اور مرثیہ پڑھنے کا حکم دیتے۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ ایک حوریہ نے حضرتؐ سے عرض کیا کہ جناب فاطمہؑ التماس کرتی ہیں کہ مقبل سے فرمایئے کہ وہ مصائب حسینؑ میں سے کوئی واقعہ پڑھے۔ پس حضرت نے مجھ کو حکم دیا اور میں نے منبر کے پہلے زینے پر کھڑے ہو کر یہ مرثیہ پڑھنا شروع کیا:

روایت است کہ چون تنگ شد بر او میدان　　　فتاد از حرکت ذوالجناح و از جولان
نہ سید الشہدا بر جدال طاقت داشت　　　نہ ذو الجناح دگر تابِ استقامت داشت
کشید پا ز رکاب آن خلاصۂ ایجاد　　　برنگ پر تو خورشید بر زمین افتاد
بلند مرتبہ شاہی ز صدر زین افتاد　　　اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد

جونہی اس بیت پر پہنچا ایک شخص نے مجھ کو اشارہ کیا کہ منبر پر سے اتر آ وَ جناب فاطمہؑ بیہوش ہوگئی ہیں۔ میں اتر آیا۔ دیکھا امام حسینؑ کی ضریح مبارک کا دروازہ کھلا اور ایک جلیل القدر شخص اس ضریح سے نکلا جس کے جسم پر بے شمار زخم لگے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ کو ایک خلعت فاخرہ عطا کیا۔ میں نے عرض کیا میں آپ پر فدا ہوں آپ کون ہیں؟

جواب دیا:

حُسینم کہ دوش نبیؐ بود جایم　　　فرستاد خلعت خدا از برایم(۱)

---

(۱) حزن المومنین، ص ۴۹۹، ۵۰۱۔

خزانۂ عامرہ اور حزن المومنین کے بعض بیاناتکی تائید مقبلؔ کے کلام سے:

خزانۂ عامرہ اور حزن المومنین کے بعض بیانات کی تائید مقبل کے کلام سے ہوتی ہے۔ حزن المومنین میں ان کا نام محمد شیخا بتایا گیا ہے، اس کی تصدیق مقبل کے اس شعر سے ہوتی ہے:

چنین به مقبل شیخا صریح شد تصریح
که از سعید مسیب روایتست صریح

خزانۂ عامرہ میں مقبل کو اصفہانی لکھا ہے۔ مقبل نے اس شعر میں اصفہان کا نام لیا ہے اور اپنے اصفہانی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے:

بچشم مردم این شهر(۱) بسکه ارزانم
سیاه روی تر از سرمۂ صفاهانم

مقبلؔ کے بارے میں معلومات مقبلؔ کے کلام سے:

حزن المومنین میں لکھا ہے کہ مقبلؔ رسولؐ خدا کا عطا کیا ہوا خطاب ہے مگر خود مقبلؔ کا قول ہے کہ ان کو یہ خطاب امام حسینؑ سے ملا تھا:

خطاب مقبلی از شاه تشنه لب دارم — پی خلاصی خود بی گمان سبب دارم
علی الخصوص که این روسیاه سر در پیش — که شاه تشنه لبش خوانده است مقبل خویش

خزانۂ عامرہ کے بیان کے مطابق مقبل سلطان حسین میرزا صفوی کے عہد میں تھے اور افغانوں کے تسلط کے زمانے میں پوشیدہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اس بیان کی تصدیق مقبل کے ہفت بند (۲) کے مندرجہ ذیل شعروں سے ہوتی ہے:

---

(۱) این شہر سے غالباً کربلا مراد ہے دیکھو وہ اشعار جو ص ۲۸۷ پر نقل کئے گئے ہیں۔

(۲) یہ ہفت بند حسن کاشی کے مشہور ہفت بند کے جواب میں کہا گیا ہے اور فارسی مرثیوں کے ایک خوشخط قلمی مجموعے میں شامل ہے جو راقم کے کتب خانے میں موجود ہے جو شعر یہاں نقل کئے گئے ہیں وہ اس نظم کے آخری بند سے لئے گئے ہیں۔

عالمی از ظلم و دست انلاز افغان شد خراب	خاصه این کشور که ویران گشت ایران شماست
آنچه از باد مخالف غرق شد در بحر ظلم	کشتیٔ ناموس و نام دوستداران شماست
این قلمرو گشت از مستوفیان زیر و زبر	آخر این ویرانه سکنای محبان شماست
مقبلت در صورت آزاد است و در معنی اسیر	گر تبه کار است اما از غلامان شماست
گرچه سلمان و ابوذر نیست اما سالها	ذاکر شاه شهید است و ثناخوان شماست

بایدش مضمون چو اخلاص تو در جان داشتن
شاعری بنگر که باید شعر پنهان داشتن

افغانوں کا تسلط ایک بلائے عظیم تھی جو شاہ حسین صفوی کے عہد میں ایران پر نازل ہوئی اور جس میں ایران ۱۷۲۲ء سے ۱۷۳۰ء تک مبتلا رہا۔ اس مدت میں قتل و غارت، قحط و وبا، کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ایرانیوں پر بالخصوص اہل اصفہان پر نہ پڑی ہو۔ ایک ایک ہلّے میں کئی کئی ہزار سپاہی مارے گئے، کئی کئی سو امیر اور شریف بے سبب قتل کئے گئے، شاہی خاندان کے لوگ چن چن کر تہ تیغ کئے گئے، شاہی خزانہ لوٹا گیا، شہر تباہ کئے گئے۔ جوان عورتیں خراج میں حاصل کی گئیں۔ آخر آٹھ برس کے بعد نادر قلی (جو بعد کو نادر شاہ ہو گیا) کی کوششوں سے ۱۷۳۰ء میں یہ بلا ایران کے سر سے دور ہوئی۔ مقبل نے اپنے ایک مرثیے میں ان مصیبتوں کا کچھ تذکرہ کیا ہے:

که ما گروه که در خفّت ایم و آزاریم	ز خادمان در اهل بیت مختاریم
مخالفان همه در کار طعنه اند بما	عجب غم است بعالم شماتت اعدا
بسا نجیب که از ظلم دستگیر شدند	بسا عزیز که با کافران اسیر شدند
بسا زنان مسلمان که کافران دورنگ	فروختند با قصی بلاد شهر فرنگ
بقیهٔ که بجا مانده اند ای غفار	به بخش شان بسر نازنین هشت و چهار(۱)

---

(۱) واقعات مقبل، ص ۲۴۴، ۲۴۵۔

خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ مقبلؔ نادر شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ ایک واقعے میں ذیل کا شعر بتاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں کہا گیا اور اس میں نادر شاہ کے حملے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

چه شورش است که در شهر هند ایجاد است

جهان سراسر ازین غم مصیبت آباداست

وہ ایک مرثیے میں عالم غربت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

شهامنم که به تلقین نفس کافر کیش ... ز ملك خویش جدا گشته ام بصد تشویش

فتاده ام به غریبی بچنگ حرص اسیر ... ز روی لطف ترحّم نما و دستم گیر

ازین دیار بسوی وطن روانم کن ... خلاص از غم و درد فراق جانم کن

مقبلؔ کو اپنے وطن جانے کی تمنا تھی، مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور ان کا انتقال گجرات میں ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں ہوا۔

حزن المومنین میں مقبلؔ کا امام حسینؑ کو خواب میں دیکھنا بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ایک مرثیے کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

شها شبی که رخت زائر نگاهم کرد ... پناه مرحمتت مرحمت پناهم کرد

بخواب تا که ترا دیده است دیدهٔ من ... شداست دیده من روشنیٔ دیده من

نداد شوق امانم بعرض مطلب خویش ... هزار مرتبه هر لحظه میگزم لب خویش

ایک مرثیے میں کہتے ہیں کہ مجھ کو غم حسینؑ میں رونے کے لئے ماں باپ نے پالا ہے۔ یہ رونا بھی میری گھٹی میں پڑا ہے۔ آل رسول کا غم میرا کام ہے۔ اپنی اولاد کو بھی وصیت کی ہے کہ حشر تک امام حسینؑ کی عزاداری کرتی رہے:

برای نوحه مرا پروریده است پدر ... ز گریه شیر بمن داده دایه و مادر

فغان و ناله وصیت ز والدین من است ... ادای تعزیه از والدین دین من است

همین وصیت من نیز هست با اولاد ... که دادِ تعزیه تا روز حشر باید داد

غرض که ماتم آل رسول کار من است گواه دعویٔ من چشم اشکبار من است

ایک دوسرے مرثیے میں کہتے ہیں کہ میں ساری عمر غم حسینؑ میں روتا رہا۔ میں عزاداری کے لئے بنایا گیا ہوں، میری جوانی امام حسینؑ کی خدمت کرنے میں صرف ہوئی ہے:

منم که پیر غلام گناه گار تو ام همیشه گریه کنان تعزیت شعار تو ام

مرا برای عزاداری تو ساخته اند خدا و خلق غلام تو ام شناخته اند

بشغل خدمت تو صرف شد جوانی من بماتم تو بسر رفت زندگانی من

امید من به تو ای سرور شهیدان است غلام پیر چو شد مستحق احسان است

مقبل اوروں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ سوائے عزاداری کے کوئی کام اور سوائے واقعات کربلا کے کوئی کلام نہ کرو:

بغیر تعزیه کاری جهانیان نه کنید

بجز وقائع کرب و بلا بیان نه کنید

ہفت بند مقبل کے مندرجہ ذیل شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبل محض مرثیہ گو نہ تھے بلکہ مرثیہ خوان بھی تھے اور شاید مرثیہ خوانی ہی ان کا پیشہ تھا:

مقبلت در صورت آزاد است و در معنی اسیر گر تبه کار است اما از غلامان شماست

گرچه سلمان و ابوذر نیست اما سالهاست ذاکر شاه شهیداست و ثناخوان شماست

اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبل کو کربلا کی زیارت کی بڑی تمنا تھی:

تواش نجات بفرمائی از ره احسان به کربلای معلی ز رحمتت برسان

☆☆☆☆☆

بمن نگر که من از دوری تو در تعبم زراه بنده نوازی به کربلا طلبم

☆☆☆☆☆

امان ز ورطهٔ پر غصه گناهش ده بکربلای خود از مرحمت پناهش ده

بکربلای تو آمادهٔ شتافتن است　　نشسته منتظر وقت اذن یافتن است

امیدوار ز الطاف نشاتین تو ام　　اگرچه روسیه ام مقبل حسین تو ام

بجان هر که مرا از جهان مسافر کن　　بر آستانهٔ آن تشنه لب مجاور کن

ذیل کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تمنا پوری بھی ہوگئی تھی۔ وہ خدا سے درخواست کرتے ہیں:

مقبل تو غم مخور که رسیدی به کربلا　　اکنون مرا ترین اجابت دی رسید



بکربلای تو سالی که میهمان بودم　　در آستانهٔ تو از مجاوران بودم

مقبل کو ایک مرتبہ کربلا کی زیارت نصیب تو ہوگئی مگر دل میں اشتیاق باقی ہی رہا وہ امام حسین سے درخواست کرتے ہیں کہ:

ز لطف بار دگر کربلا نصیبش کن　　ز آشنا و رفیق وطن غریبش کن

ایک مرثیہ جو مقبل نے غالباً کربلای معلّیٰ میں کہا تھا اس کے آخری چند شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبل مستقل قیام کرنے کے ارادے سے کربلا گئے تھے مگر وہاں ان کی کچھ قدر نہ ہوئی اور قیام کی کوئی صورت نہ نکلی تو کربلا سے مشہد مقدس کے سفر کا تہیہ کیا اور باقی عمر وہیں بسر کرنے کا ارادہ کرلیا۔ خدا جانے وہ مشہد پہنچ سکے یا نہیں۔ بہر حال اتنا تو معلوم ہی ہے کہ ان کی عمر کا آخری حصہ ہندوستان میں گزرا اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

شها منم که ز روی یقین غلام تو ام　　به مقبلی تو درد هر نیك نام تو ام

بچشم مردم این شهر بسکه ارزانم　　سیاه روی تر از سرمهٔ صفاهانم

اگر بمرتبه نالائق دیارِ تو ام　　غلام تعزیه دار گناهگار تو ام

بکربلای تو ای آفتاب انور من　　بدفن آمده بودم نشد میسر من

بر آستان تو کز بهر مدفنم جانیست　　امیدوارم و این آرزوی بیجانیست

مرا بمشهد شاه رضا مرخّص کن　　پی تدفن من طوسی را مشخص کن

امید من بسوی مشهد امام رضاؑ ست　　من و طواف رضا و رضا رضای خداست

ایک دوسرے مرثیے کے اشعار ذیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقبل جب کربلا پہنچے تو اپنی بقیہ عمر وہیں صرف کرنا چاہتے تھے اور وہیں کی خاک کا پیوند ہو کر گناہوں سے نجات پانے کی امید رکھتے تھے مگر ان کی یہ دیرینہ آرزو پوری نہ ہوئی:

منم که مقبلؔ و ناقابل جناب تو ام　　همیشه منتظر لطف بیحساب تو ام

بکربلای تو سالی که میهمان بودم　　در آستانهٔ تو از مجاوران بودم

بکربلای تو سگ دیدم و حسد دارم　　چرا که من بهمین منزلت رسد دارم

خصوص پیر سگی دیدم و دلیر شدم　　باین امید و باین چشمداشت پیر شدم

بکربلای تو گر بعد مرگ خاك شوم　　باین وسیله مگر از گناه پاك شوم

نه کرد نفع بحال من آدمیّت من　　رسد مگر به مداوای من سگیّت من

واقعات مقبلؔ:

مقبل نے اپنے مرثیے زیادہ تر مثنوی کی شکل میں اور ایک مخصوص بحر میں کہے ہیں۔ اور ان کے عنوان اس طرح قرار دیئے ہیں:

واقعهٔ شهادت حضرت فاطمه زهراؑ، واقعه شهادت حضرت امیر المومنینؑ

واقعه وداع حضرت سید الشهداؑ... از مدینه

واقعه نزول حضرت امام حسینؑ به بیت الله و روانه شدن به کربلای معلی

واقعه شهادت حضرت شاهزاده قاسم

واقعه وصیت حضرت سید الشهدا... و تشریف بردن بمیدان و فائز شدن به سعادت شهادت ...

واقعه رفتن اهلبیت بکوفه و کلام کردن ضعیفه مومنه بحضرت زینب

واقعه مراجعت نمودن حضرت امام زین العابدینؑ بکربلا از شام

انہیں عنوانوں کی بنا پر مقبل کے مرثیے واقعات کہلاتے ہیں۔ مقبل نے اپنے بعض مرثیوں میں واقعہ یا واقعات کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا مثلاً:

کسی کہ مقبل او شد چرا بود ابتر　　　　برای واقعۂ او کشادہ ام دفتر

☆☆☆☆☆

دمی ز مستمعان باش و گوش دل بکشا　　　　برای واقعۂ قتل سید الشھدا

☆☆☆☆☆

چو ناقلان سخن شرح غم حکایت کرد　　　　ز واقعات جگر تشنگان روایت کرد

مقبل کے واقعات فارسی مرثیوں کے قلمی مجموعوں میں بالعموم ملتے ہیں۔ ایسے دو مجموعے میرے کتب خانے میں بھی ہیں۔ ایک میں مقبل کے بیس واقعات اور دوسرے میں مقبل کی صرف پانچ نظمیں ہیں جو بعض حیثیتوں سے بہت اہمیت رکھتی ہیں، ان نظموں کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ قلمی بیاضوں کے علاوہ فارسی مرثیوں کا ایک مجموعہ مطبع نولکشور لکھنو میں ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں چھپا تھا۔ اس مجموعے میں مقبل کے انیس واقعات شامل ہیں۔ یہ مجموعۂ مراثی حاجی نواب تقی علی خان کربلائی نبیرۂ نواب شجاع الدولہ بہادر فرمانروائے اودھ نے مرتب کیا تھا۔ انہیں نواب صاحب نے مقبل کے دو واقعے جو بقول ان کے مطبع نول کشور کے کارپردازوں نے تعصب مذہبی کے سبب نکال ڈالے تھے علیحدہ مطبع شوکت جعفری لکھنو میں چھپوا دیئے تھے۔

واقعات کے علاوہ مقبل کی نظمیں:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مقبل نے واقعات کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے صرف واقعات ہی مشہور ہوئے اور وہی قلمی بیاضوں میں ملتے بھی ہیں۔ لیکن میرے پاس ایک قلمی مجموعۂ مراثی میں مقبل کی پانچ نظمیں ایسی موجود ہیں جو شکل یا موضوع یا دونوں کے اعتبار سے ان

کے واقعات سے الگ ہیں۔ ان میں کی پہلی نظم اکتیس شعر کا ایک مرثیہ مثنوی کی شکل کا ہے۔ اس کا عنوان کاتب نے ''مرثیہ مقبل'' قرار دیا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

یاران نظر بواقعہ کربلا کنید　　یاد از شکستہ حالی آل عبا کنید

اس مرثیے میں اور واقعات میں خاص فرق وزن عروضی کا ہے۔ مقبلؔ کے واقعات بحر مجتث مخبون مقصور یا محذوف میں ہیں یعنی ان کا وزن یہ ہے:

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلان یا فعلن

اور یہ مرثیہ اس بحر میں نہیں ہے۔ غالباً اسی نمایاں فرق کی وجہ سے کاتب نے اس مرثیے کو واقعہ نہیں کہا حالانکہ لفظ واقعہ اس کے مطلع میں موجود بھی ہے۔ یہ مرثیہ ایک دوسرے قلمی مجموعے میں بھی شامل ہے۔

دوسری نظم کا عنوان مرثیہ'' ہفت کواکب'' ہے۔ یہ بارہ بندوں کا ایک ترجیع بند ہے۔ ہر بند میں ترجیع کا شعر ملا کر ۶ شعر ہیں۔ اس نظم میں مصنف نے مختلف چیزوں کو خطاب کر کے امام حسینؑ کا غم کرنے کی تاکید کی ہے۔ دوسرے بند سے آٹھویں بند تک ہر بند میں سات سیاروں میں سے ایک ایک کو مخاطب کیا ہے۔ اسی بنا پر اس مرثیے کا نام مرثیہ ہفت کواکب رکھا گیا ہے۔ اس مرثیے کا پہلا بند یہ ہے:

ای نالہ در این تعزیہ تحصیل اثر کن　　آہ جگر سوختہ را نیز خبر کن

ای آتش آہ جگر سوختہ برخیز　　چون شعلۂ جوّالہ جہان پُر ز شرر کن

ای دل تو ہم از تعزیۂ آل پیمبر　　یك قطرۂ خون گرد و سر از دیدہ بدر کن

ای دیدہ سرشك تو چرا رنگ ندارد　　در یوزۂ اشکی ز سویدای جگر کن

ای شیعہ اگر پیروِ اولادِ رسولی　　در فرقت شاہ شہد اخاك بسر کن

این وردِ زبان ساز در این ماہِ محرم

با نالہ و فریاد کہ مظلوم حسینم

تیسری نظم ایک مناجات ہے۔ اس میں کل دس شعر ہیں۔ جن میں سے تین درج ذیل ہیں:

ای سوی در گهه تو راه همه — بکف بخششت نگاه همه

غم ز بدخواهی خلائق نیست — چونکه هستی تو خیر خواه همه

لطف کن بیشتر بمن که بود — گنهم بیش از گناه همه

چوتھی نظم بارہ شعر کی ایک نعت ہے، ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

ای براندازهٔ جاه تو رسول اللّهی — منصب خاص جناب تو حبیب اللّهی

قامت رتبهٔ جاهِ تو بحدّیست رسا — که کند خلعت معراج بر آن کوتاهی

هفت بند مقبل:

پانچویں نظم جو اس مجموعے میں مقبل کی آخری نظم ہے، حضرت علیؑ کی مدح میں ایک ہفت بند ہے۔ یہ ملا حسن کاشی کے مشہور ہفت بند کے جواب میں کہا گیا ہے۔ اس کی بحر وہی ہے۔ ہر بند کا قافیہ و ردیف وہی ہے۔ بندوں میں شعروں کی تعداد وہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت تفصیلات میں بھی بہت مشابہت ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنا ہفت بند کہتے وقت مقبل نے کاشی کا ہفت بند اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ ذیل میں ہفت بند مقبل کا پہلا بند نقل کیا جاتا ہے:

السلام ای اشرف خلق اله العالمین — قبلهٔ ام القریٰ تکبیرة الاحرام دین

اسم اعظم، عقل، مالك رقاب انس و جان — آیهٔ رحمت، امام دین امیر المومنین

مسند آرای خلافت، آفتاب کائنات — قرة العین ملائك عرش را کرسی نشین

قاسم ارزاق از ممّا رزقنا ینفقون — ساقی أنهار خمرٌ لذةٌ للشاربین

انبیا و اوصیا را در حقیقت چون الف — هم به معنی اولین وهم بصورت آخرین

منشی دیوان وصفت مالك یوم الحساب — شاهد فضل و کمالت رحمة للعالمین

مرغ دست آموز باغ دانشت روح القدس — طفل ابجد خوان بمکتب خانه ات روح الامین

خرج و دخل مشرق و مغرب به فرّ مهر و ماه — می زند از نسخهٔ امرت کرامٌ کاتبین

حق کلام خویش از نام تو بر کرسی نشاند | شد ازین معنی علیؑ با آیة الکرسی قرین
آنچه می آید از اسم اعظم پروردگار | از علیؑ می آید آن با معجزات بیقرین
محضر کرّوبیان را از تو تحریر سجل | خاتم پیغمبران را نام تو نقش نگین
در هوای جستجویت چرخ یك بیهوده گرد | در فضای اقتدارت خضر یك صحرا نشین

آنکه از اسرار ذات کردگار آگهه بود
واقف از اسرار ذاتش هم رسول اللّٰہ بود

ہم اوپر کاشی اور محتشم کے ہفت بندوں کے ابتدائی بند نقل کر چکے ہیں، مقبلؔ کا یہ بند ان بندوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھئے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقبل اگر چہ کاشی کے برابر نہیں پہنچ سکے مگر محتشم سے پیچھے نہیں رہے۔

میرے کتب خانے میں مراثی فارسی کا ایک اور قلمی مجموعہ ہے۔ اس میں مقبل کا ایک مرثیہ قصیدے کی شکل کا بھی موجود ہے۔ اس میں کل پچپن شعر ہیں۔ اس کے شروع اور آخر کے تین تین شعر درج ذیل ہیں۔

از ماه محرم بفلك خیمهٔ دیبا | منسوخ شد از شَعشعه اش رایت بیضا
ای دیده اگر هست ترا نور بصیرت | خون دل خود ریز در این ماتم عظما
بنگر که چه آمد بسرِ آل محمدؐ | در کرب و بلا از ستم و شومیٔ اعدا

....

هرچند که مستغرق دریای گناهیم | امید چنانست که در معرض فردا
از بهر لب تشنهٔ سلطان شهیدان | سازی همه را داخل فردوس معلّا
یا شافع فردای قیامت نظری کن | از روی کرمها به سوی مقبلؔ شهدا

قصیدے کی شکل کا ایک مرثیہ مقبل کا اور بھی مشہور ہے۔ یہ مرثیہ ذیل میں ایک پرانی بیاض سے نقل کیا جاتا ہے جو راقم کے کتب خانے میں موجود ہے:

در کربلا چو آن شه هر دو سرا رسید | بهر سلام با ادب اول قضا رسید

یك گام برنداشت ز بی مهری فلك | اسپ حسینؑ چونکه بکرب و بلا رسید

آسودگی نه گشت میسر بر آن زمین | از چرخ بر حسینؑ بلا بر بلا رسید

یاران شدند قتل همه روبروی او | نوبت کنون بقاسمؑ نو کتخدا رسید

قصر زمردی شده ماتم سرای خُلد | پیش حسنؑ چو قاسمؑ گلگون قبا رسید

کوثر باین سبب شده از شرم آب آب | عباسؑ تشنه لب چو زدار فنا رسید

از نیزهٔ که سینهٔ اکبر فگار شد | آن نیزه آه بر جگر مصطفیؐ رسید

بر حلق خشك اصغرؑ نادان ای فلك | تیر قضا ز لشکر اهل جفا رسید

شهدا ز چشم منع نمودند آن زمان | در قتلگاه چون خلف مرتضاؑ رسید

شه گفت چون بغیر شما در جهان زیم | از بهر ما جفای چنین بر شما رسید

بهر سجود گشت چو شبیرؑ سرنگون | در عین سجده خنجر کیں از قفا رسید

بنگر فلك جفا که همه فوج اشقیا | اکنون بروئے غارت ماتم سرا رسید

اشتر کشان زکرب و بلا آه نیم جان | تا شهر شام آدم آل عبا رسید

در مجلس یزید همه ها گریستند | چون سر برهنه دختر خیر النساؑ رسید

اهل مدینه حشر نمودند آن زمان | بر روضهٔ رسول چو زین العباؑ رسید

مقبلؔ تو غم مخور که رسیدی به کربلا
اکنون ترا قرین اجابت دعا رسید

مقبلؔ نے اس مرثیے میں نہایت اختصار کے ساتھ داخلۂ کربلا سے واپسی مدینہ تک کے کل حالات بیان کردئے ہیں۔ آخری شعر سے قیاس ہوتا ہے کہ مقبل نے یہ مرثیہ کربلا میں کہا تھا۔

ان نظموں کی موجودگی میں یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ مقبل نے واقعات کے سوا کچھ نہیں کہا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مقبل کے کلام کا بہت بڑا حصہ مرثیوں میں اور ان کے مرثیوں کی بہت بڑی تعداد واقعات

پر مشتمل ہے۔ مقبل غالباً پہلا ایرانی شاعر ہے جس نے تقریباً ساری عمر مرثیہ گوئی کی نذر کر دی۔

مقبل کے واقعات کا نمونہ:

واقعات مقبلؔ کا نمونہ دکھانے کے لئے ذیل میں اس واقعے کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جس کے متعلق مقبل کا ایک خواب حزن المومنین کے حوالے سے اوپر بیان کیا گیا۔ ان شعروں کے بیچ بیچ سے بہت سے شعر حذف کر دئے گئے ہیں۔ پورے واقعے میں ۵۹۱ شعر ہیں اور یہ واقعہ مطبع نولکشور کے چھپے ہوئے فارسی مرثیوں کے مجموعے میں صفحہ ۱۰۹ سے شروع ہوتا ہے:

محرم آمد و تجدید شد عزای حسینؑ — رسید موسم طوفان بکربلای حسینؑ

روایت است که چون گشت عازم میدان — بآرزوی شهادت امام تشنه لبان

مخدرات تمامی به نوحه و ماتم — روان شدند بدنبال آن امام اُمم

سکینه برهمگی سبقت از شتاب گرفت — دویده شاه جگر تشنه را رکاب گرفت

دل شکسته و اعضا به لرزه چون سیماب — خطاب کرد بسوی پدر به چشم پُر آب

براه گلشن فردوس گشتهٔ سفری — تو میروی و مرا نیست تاب بی پدری

زدوریت نه همین من الیم خواهم بود — تو چون شهید شدی من یتیم خواهم بود

ترا گهی که تمنا کنم کجا جویم — پی تسلی خاطر پدر کرا گویم

بمن کسی ز تو دل گرم تر نخواهد بود — هزار دوست یکی چون پدر نخواهد بود

چو این حدیث شنید از سکینه شاه شهید — نم تلابهٔ داغ دلش بدیده رسید

خطاب کرد بسوی سکینه آن سرور — بگریه گفت که ای با غم آشنای پدر

غمین مباش که پروردگار یاور تست — جناب حضرت زین العبا برادر تست

رفاه امت بیچاره در مشقت ماست — غم شفاعت شان شربت شهادت ماست

بگفت و گشت روان سوی لشکر اعدا — بدیده های پُر از آب سید الشهدا

روایت است که چون تنگ شد بر او میدان — فتاد از حرکت ذو الجناح و ز جولان

نہ سید الشہدا بر جدال طاقت داشت | نہ ذو الجناح دگر تاب استقامت داشت

روایت است کہ در پیکر شہ ذی جود | ہزار و نہ صد و پنجاہ و یک جراحت بود

نبود بر سر آن تشنہ کام غمخواری | نداشت جز بدن پارہ پارہ دلداری

کسی کہ خون ز رخش شست اشک جاری بود | کسی کہ سوخت بآن زخمہای کاری بود

فتادہ بود بہ این حال سبط پیغمبرؐ | ستادہ بود بہ طراف آن صفِ لشکر

چو ابن سعد لعین دید حالت او را | طلب نمود ز لشکر شہادت او را

کسی قبول شہادت نہ کرد از لشکر | شد آن لعین ستمگار عاجز و مضطر

چہ از حکایت شمر لعین کنم تقریر | کہ ہست قصۂ آن رو سیاہ عالمگیر

مقبل کے مرثیوں میں تخیل کی وہ بلندی اور بیان کا وہ زور تو نہیں ہے جو محتشم کے مرثیے کا طرہ ٔ امتیاز ہے لیکن انھوں نے صاف، سلیس، رواں اور پُر اثر انداز میں تمام واقعاتِ کربلا کو تفصیل کے ساتھ نظم کر کے مرثیے کو خواص وعوام سب میں مقبول کر دیا۔

مخلص کاشی:

میرزا محمد مخلص کاشی اعتماد الدولہ محمد مومن خان شاملو کی مدح میں قصیدے کہہ کر بھیجتا تھا مومن خان نے اس کو کاشان سے اصفہان میں بلا لیا اور بڑی خاطر سے رکھا۔

اعتماد الدولہ اور مومن خان شاہ سلیمان صفوی (۱۶۶۶۔۱۶۹۴ء) کے اواخر عہد میں وزارت کے اعلیٰ منصب پر پہنچا اور شاہ سلیمان کی وفات کے بعد سلطان حسین صفوی (۱۶۹۴۔۱۷۲۲ء) کے عہد میں وزیر رہا۔ مخلص کاشی نے ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا اور جامع عتیق اصفہان کے قبرستان میں دفن ہوا۔ (۱) مخلص خوش تلاش اور صاحب دیوان شاعر تھا، آزاد بلگرامی نے اس کے دیوان غزل سے چند شعر تذکرہ سرو آزاد میں درج کئے ہیں۔ (۲)

---

(۱) تذکرۂ بے نظیر، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ (۲) مآثر الکرام، دفتر ثانی، موسوم بہ سرو آزاد، ص ۵۲۱۔

مرثیوں کی بیاضوں اور قلمی مجموعوں میں مخلص کے مرثیے ملتے ہیں۔ مجموعہ واقعات مقبل وغیرہ مطبوعہ مطبع نول کشور، لکھنو میں بھی اس کے تین مرثیے شامل ہیں اور یہ تینوں ''واقعات'' ہیں۔ ایک خوش خط اور مطلا قلمی مجموعے میں مخلص کی چودہ نظمیں ہیں جن میں چار مرثیے، دو سلام، دو نوحے غزل کی صورت میں، ایک مرثیہ غزل مستزاد کی صورت میں تین مخمس ترکیب بند، ایک مرثیہ ترجیع بند، اور ایک مرثیہ ''بحر طویل'' میں ہے ایک دوسرے قلمی مجموعے میں مخلص کے دو مرثیے ہیں۔ دونوں واقعات ہیں اور دونوں کے آخری شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخلص ہندوستان میں موجود اور کربلا کی زیارت کا مشتاق تھا۔ وہ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

مهیمنا ملکا قادرا خداوندا	بحق روضهٔ پر نور سید الشهدا
که از سحاب ترحم نظر به مخلص کن	ز خاك تیرهٔ هندوستان مرخص کن
به کربلای معلای مجتبی برسان	که جان نیاز نمایم بر آن امام زمان
به کار مخلص اگر عقده ای ز ساده دلی ست	کشا ز لطف که این مخلص حسینؑ علیؑ ست
ز خاك تیرهٔ هندش به کربلا برسان	زجام بادهٔ مقصود نشه اش بچشان.

با قاعدہ اور اعلیٰ درجے کے مرثیوں کے علاوہ بہت سی سادہ اور نہایت پُر اثر نظمیں، جن میں محرم کی عزاداری کے دوران میں ایرانیوں کے مذہبی جذبات کا اظہار ہوتا ہے، صفوی عہد کی پیداوار ہیں جب کہ علیؑ کے گھرانے کے لئے احترام کے، اور ان پر ظلم کرنے والوں کے لئے نفرت کے جذبات ابھارنے اور بڑھانے کے واسطے ہر ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔(۱)

خطا اور صواب:

۲۱/۱ اکتوبر ۱۷۲۲ء، (محرم ۱۱۲۵ھ) کو شاہ حسین صفوی تخت سے دست بردار ہو گیا اور تاج شاہی

---

(۱) براون، جلد چہارم، ص ۸۲۔

افغان حملہ آور میر محمود کی نذر کر دیا۔ ۲۷/ اکتوبر کو میر محمود ایران کا بادشاہ ہو گیا اور صفویوں کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد صفوی خاندان کے دو برائے نام بادشاہ اور ہوے۔ شاہ طہماسپ ثانی اور اس کا چھ مہینے کا بچہ شاہ عباس ثالث، مگر وہ نادر شاہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس برائے نام صفوی عہد اور در اصل نادر شاہ کے عہد حکومت میں ہم کو صرف ایک ایرانی شاعر کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے۔

صفوی خاندان کا اقتدار ختم ہونے کے بعد قاچاری حکومت قائم ہونے تک ایران کی ستر برس کی تاریخ خونریزیوں اور خانہ جنگیوں کی داستان ہے، اس زمانے کے ادب وشعر کے بارے میں ہماری معلومات تقریباً صفر ہے۔ عزاداری اس زمانے میں بھی ہوتی ہوگی اور مرثیے بھی کہے جاتے ہوں گے لیکن ایسے ایرانی مرثیہ گو جن کے حالات کا ہم کو کچھ علم ہے صرف دو ہیں۔ ایک ملا محمد خطاؔ شوستری اور دوسرے ان کے بیٹے مرزا محمد علی صوابؔ، روضہ خوانی کی کتابیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں ان میں مرثیے کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ لیکن بہت سے مرثیوں میں شاعر کا تخلص نہیں ہے اور جن میں تخلص موجود ہے ان کے نام ونشان سے ہم ناواقف ہیں۔ ایسی کئی کتابوں کے مصنف اگرچہ ایرانی ہیں، لیکن وہ ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اور اس زمانے میں فارسی کے سیکڑوں شاعر ہندوستان میں موجود تھے۔ اس لئے جن شاعروں کے مرثیے ان کتابوں میں ہیں ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کون ایرانی ہیں اور کون ہندوستانی۔

اس وقت فضل علی کتاب خوان ولد آقا محمود ابن آقا احمد اصفہانی کی کتاب محیط العزا میرے پیش نظر ہے۔ مصنف کے پاس مسودے لکھے ہوے پہلے سے موجود تھے، مگر ان کو کتاب کی صورت میں ترتیب دینے کا کام ۱۲۲۱ھ میں شروع کر کے ۱۲۲۲ھ میں ختم کیا۔ میرے کتب خانے میں اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کو خود مصنف نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ۸/ شعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنو میں تمام کیا۔ اس میں محتشم کاشی کا دوازدہ بند مرثیہ اور اس کے علاوہ بہت سے مرثیے شامل ہیں۔ جن شاعروں کے تخلص

موجود ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

خطا، صواب، محسن، نگین، ببر علی، زائر، جعفری، جعفر علی، سلمی، حسن، تقی، شورش، گدا، کلب، خالص، مظہر صبا، سید، احمدی، سلامی، رسا، صادق، موسوی، فضل علی۔

ان شاعروں میں صرف ببر علی کے متعلق ان کے دو مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مقیم اور غالباً ہندوستانی تھے اور کربلا پہنچنے کا بہت اشتیاق رکھتے تھے۔

دارد امید از تو ببر علی ز رحمت ‏ ‏ ‏ ‏ سازی طلب به یثرب در هند سر گرانم



ببر علی تو بر گو در خدمت محبان ‏ ‏ ‏ ‏ امروز گر به هندیم فردا به کربلائیم

قرینے ایسے موجود ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ ان مرثیہ گویوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا صفوی عہد اور قاجاری عہد کے درمیانی زمانے سے تعلق ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے ہم اس زمانے کے صرف دو مرثیہ گویوں کے بارے میں کچھ واقفیت رکھتے ہیں، خطا کے بارے میں زیادہ، صواب کے بارے میں کم۔

ملا محمد خطا شوستری:

خطا کے ہم وطن میر عبداللطیف خان شوستری مصنف تحفۃ العالم کا بیان ہے کہ مولانا محمد شوستری خطا تخلص ایک نغز گفتار شاعر اور پسندیدہ اطوار مصاحب ہیں۔ شوستر ہی سے مجھ سے مضبوط رشتۂ الفت رکھتے ہیں۔ مدت سے لکھنو میں مقیم ہیں، مولانا شوستری جب سن تمیز کو پہنچے اور اپنی طبیعت کو موزوں دیکھا تو وہاں سے نکل کر شیراز چلے گئے، جہاں شعرا اور فضلا کا مجمع تھا اور عراق عجم کے بعض شہروں میں ہم عصر شاعروں سے میل جول رکھا۔ وہاں کی روح پرور ہوا اور فیض گستر شاعروں کی صحبت سے ان کی زبان میں روانی آگئی اور وہ ان کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ ائمہ ہدیٰ اور سید الشہدا کی مدح میں بلند پایہ قصیدے اور مرثیے کہے ہیں ان کا دیوان دس بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ وہ

شاعری میں سلمان ساوجی کا انداز رکھتے ہیں اور سلمان کے قصیدوں کی پیروی کرنا بازوے قوی اور دست رسا چاہتا ہے۔

(ملا خطا) عزاداری اور مرثیہ خوانی میں بے مثل اور حسن صورت، نغمہ سرائی، مہارت موسیقی اور آداب صحبت میں عدیم المثال ہیں، مجالس عزا میں اور مرثیہ خوانی میں لوگ کتنے ہی خوش وقت اور قسی القلب ہوں ان کو اتنا رلاتے ہیں کہ وہ بے خود ہو جاتے ہیں اور آپس کی صحبتوں میں اہل بزم کتنے ہی مغموم اور خشک مزاج ہوں، اپنی زمزمہ پردازی اور بذلہ سنجی سے ان کو ہنساتے اور خوش کر دیتے ہیں۔

وہ ہندوستان میں آئے تو آصف الدولہ (فرماں روائے اودھ) نے ان کی عزت کی اور اپنے امام باڑے کی روضہ خوانی کا افتخار بخشا۔ اس وقت تک ان کو اس خدمت عظمیٰ کا فخر اور آسائش کی زندگی نصیب ہے۔ میں جب تک لکھنو میں رہا وہ برابر دن رات میرے انیس و جلیس رہے اور اپنی رنگین صحبتوں اور دل کش نغموں سے میرے دل کی کلفت دور کرتے رہے۔

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ملا خطا نے نواب سعادت علی خان کے جلوس کی تاریخ ایک رباعی میں کہی اور نواب ان پر التفات فرماتے رہے۔ وہ رباعی درج ذیل ہے:

سر رشتۂ مملکت بھم می پیچید　　　　و ز صبح سعادتی مدد می طلبید
حق تاج امل از سر باطل برداشت　　　　در روز جلوس حق بحق دار رسید(۱)

احمد علی خان یکتا لکھنوی کی کتاب ''دستور الفصاحت'' میں ہے کہ ایک دن میر تقی میر نیا قصیدہ کہہ کر نواب آصف الدولہ کے دربار میں آئے، قصیدہ پڑھنا شروع کیا اور اس میں طول دیا۔ اتفاق سے اس دن ملا محمد ایک تازہ وارد ایرانی شاعر کو نواب کی ملازمت کے لئے لائے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھی نواب کی مدح میں کچھ پڑھے۔ لیکن میرؔ کے قصیدے کی طوالت سارا وقت لے لیتی تھی۔ آخر تنگ آ کر بولے، میرؔ صاحب آپ کا قصیدہ خوب ہے مگر طولانی ہے۔ اگر نواب صاحب کا دماغ وفا نہ

---

(۱) تحفۃ العالم ص ۳۵۶، ۳۵۷۔

کرتا تو کون سنتا۔ یہ سنتے ہی میر نے بیاض پھینک دی اور منغض ہو کر کہا کہ اگر نواب صاحب کا دماغ وفا نہ کرتا تو میرا دماغ کب وفا کرتا، انھوں نے ذرا بھی نواب کا پاس نہ کیا مگر نواب نے نہایت مہربانی اور منتوں سے ان کو منایا اور پورا قصیدہ سنا اور ملا کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ صیغۂ اخوت پڑھا تھا یعنی ان کو اپنا بھائی بنایا تھا۔(۱)

مصنف قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ دو گھڑی رات رہے خواب سے بیدار ہوتے تھے اور نماز صبح سے پہلے قرآن مجید کے دور کوع کی تلاوت کرتے تھے، استاد ملا محمد بیٹھ کر سنتے تھے ،نواب کے انتقال کے بعد ہر پنج شنبہ کو ان کی قبر پر مجلس ہوتی تھی اور ملا محمد روضہ خوانی کرتے تھے۔(۲)

یہی مصنف لکھتا ہے کہ ملا محمد نے آصف الدولہ کے انتقال کی تاریخ یہ کہی تھی جو بہت مشہور ہوئی ''ھٰھُنا رَوحٌ و ریحانٌ و جنّاتِ النَعیم''۔

ندیم ملا محمد ندیم روضہ خوان صفاہانی زمزمہ سنج بزم سخن سرائی وخوش بیانی ست۔ از وطن بہ ہند رسید و در دار الحکومت لکھنو بہ اتالیقی و مقاومت نواب وزیر علی خان متبنّیٰ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر ملازم گردید، فی الحال از کلامش جز این قطعہ تاریخ بہم نہ رسید (یہاں اس قطع کے پانچ شعر نقل کئے ہیں، گلشن عشرت بتاراج خزان رفت ای ندیم)۔(۳)

ملا محمد نے آصف الدولہ کے انتقال پر چھ شعر کا قطعۂ تاریخ کہا تھا، جس کا آخری مصرع اوپر درج کیا گیا ہے، پورا قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

گلشن عشرت بتاراج خزان رفت ای ندیم | شامه استشمام حسرت می نماید از نسیم

آصفی کان نه صدف را یك دُرشهوار بود | آن در شهوار رفت از دست و عالم شد یتیم

---

(۱) دستور الفصاحت، ص۲۵، ۲۶۔

(۲) قیصر التواریخ، جلد اول، ص۱۲۱۔

(۳) صبح گلشن از علی حسن خان، ص۵۱۳۔

لکھنو بی آصف است و آسمان بی آفتاب — شهر یونان بی مسیح و طور سینا بی کلیم
دارد آصف عشرتی در صحن آصف باغ خلد — انبیا همدم سلیمان هم نشین آصف ندیم
نقد رحمت در کفاف و فرد بخشش در بغل — بر کریمان جنس غفران است اعطای کریم
نقش بند کاف و نون بر تربت آصف نوشت — هٰهنا رَوحٌ وَ ریحانٌ و جَنّاتِ النّعیم (۱)

مہاراجہ جے گوپال ثاقبؔ نے اپنی کتاب زبدۃ الکوائف (۲) میں آصف الدولہ کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قطعه از نتائج طبع سلیم ملا محمد روضه خوان صفاهانی متخلص به ندیم استاد مرزا وزیر علی خان که بر لوح متصل مرقد منور آن جناب بقلم جلی حافظ نور الله مرحوم مرقوم است اینست''۔

اس کے بعد مندرجہ بالا قطعہ نقل کیا ہے۔ اس قطعے کے پہلے مصرعے میں لفظ ندیم سے دھوکا کھا کر ملا محمد کا تخلص ندیم سمجھ لیا ہے۔

نجم الغنی مصنف تاریخ اودھ کو بھی یہی دھوکا ہوا۔ انہوں نے اس قطعے کے مصنف کا نام آغا محمد ندیم روضہ خوان مصنف بحر البکا، بتایا ہے کہ وہ روضہ خوانی، مرثیہ گوئی اور خوش بیانی میں کمال رکھتے تھے۔ (۳)

شیخ مصحفی نے ملا خطا کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''ملا محمد کتاب خوان خطا تخلص از اهل ایران است ، خطبه و کتاب جناب سید الشهداعلیه السلام بسیار به لهجه درست می خواند و درین کار در معاصرین خویش نظیر خود ندارد ، جمهور بر این متفق اند ، و ماورای آن در نثر و نظم خود هم رخش طبیعت را بمیدان فصاحت جولان دهد، اما بیشتر در روایات شهادت امام

---

(۱) واقعات ملا خطا شوستری، ص ۲۴۵۔

(۲) زبدۃ الکوائف اودھ کی تاریخ ہے جو سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد لکھ کر مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔

(۳) تاریخ اودھ حصہ دوم، ص ۳۵۱۔

حسین علیہ السلام''۔(۱)

تذکرہ روز روشن میں ہے کہ ملا محمد خطا شوستری کتاب خوانوں اور ذاکروں کے زمرے میں خوش الحانی اور شیوا بیانی میں ممتاز تھے، وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنو پہنچے اور نواب وزیر کی سرکار میں کتاب خوانوں میں شامل ہو گئے، نواب سعادت علی خان بہادر کے عہد تک زندہ تھے۔ وہ کتاب بحر البکا کے مولف ہیں، ان کے اشعار میں بیشتر مرثیے اور نوحے ہیں، خطاؔ کا ایک شعر اور ایک رباعی، جو نواب سعادت علی خان کی مسند نشینی کی تہنیت میں کہی تھی، نقل کی ہے، رباعی اوپر درج کی جا چکی ہے، شعر یہ ہے۔

بزیر قبۂ آن تشنہ لب نہ قندیل است　　دل پر آبلۂ داغ دار جبریل است(۲)

ملا خطاؔ اور مرزا قتیلؔ:

ملا خطا اور مرزا قتیل میں تعلقات تھے، ایک مرتبہ خطاؔ نے ایک منظوم خط قتیلؔ کو بھیجا، اس کی منظوم رسید جو قتیلؔ نے بھیجی وہ ان کے خطوں کے ایک مجموعے میں اس عنوان کے تحت شامل ہے۔ ''رقعہ نظم مرزا قتیل صاحب برائے ملا محمد روایت خوان متخلص بہ خطاؔ رقعہ حسب ذیل ہے:

ای نَیِ کلك روانت غیرت ابر بهار　　نامه ات رشك بهارستان فردوس برین

هر الف از راستی شمشاد باغ ناز بود　　سطرهایش موج کوثر نقطه خال حور عین

مو قلم بوده است گوئی کلك گوهر سلك تو　　صفحۂ قرطاس را کردی نگارستان چین

موج زن بحر فصاحت بود از هر قطره اش　　لفظها همچون صدف معنی گهرهای ثمین

روح را بالیدگی روزی شد از مضمون آن　　شاد شد از دیدن او خاطر اندوه گین

---

(۱) ریاض الفصحا، ص ۹۸۔

(۲) روز روشن، ص ۲۰۰۔

همچو بوے گل معلق در هوا استاده ام　　بسکه پاے من نمی آید ز شادی بر زمین

هر چه گفتی ای خطائی بی خطا پاك از خطاست　　بر تو و بر نظم تو بادا هزاران آفرین (۱)

واقعہ خوان:

اس نظم کے عنوان میں خطاؔ کو روایت خوان کہا گیا ہے جس سے واقعہ خوان مراد ہے یعنی ان مرثیوں کا پڑھنے والا جو واقعات کہلاتے ہیں۔ واقعات کو پڑھنے کے لئے ایک مخصوص لحن مقرر ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے لڑکپن میں چند بوڑھے واقعہ خوانوں کو عشرۂ محرم میں آصف الدولہ کے امام باڑے کی مجلس میں پڑھتے سنا ہے۔

میری اہلیہ مرحومہ کی دادی صاحبہ مرحومہ لکھنو کے ایک واقعہ گو شاعر میر محمد عباس موزوںؔ کی صاحب زادی تھیں، وہ واقعات پڑھتی تھیں۔ میں ان کو بھی پڑھتے سنا ہے۔ اب ایک مدت سے واقعہ خوانی متروک ہے اور واقعہ خوان معدوم، واقعات میں روایتیں بیان کی جاتی ہیں اور فارسی واقعات میں ہر واقعے کے اجزا ''روایت است'' کے فقرے سے شروع ہوتے ہیں اس لئے واقعہ خوان کو'' روایت خوان'' بھی کہتے تھے۔

ملا خطا کے کچھ عزیز اور شاگرد:

اصفہان کے ایک عالم ملا احمد بن محمد علی بن محمد باقر ایران سے ہندوستان آئے۔ وہ یکم صفر ۱۲۲۰ھ کو بمبئی پہنچے اور بمبئی، حیدر آباد، کلکتہ، مرشد آباد، فیض آباد، لکھنؤ میں کچھ دن قیام کیا اور وہاں کے حالات اپنی کتاب مرات الاحوال جہاں نما میں لکھے، اپنا تفصیلی حال اور ایران و عراق کے متعدد علما و مشاہیر کے حالات بھی لکھے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۰ رجب ۱۲۲۲ھ سے ۷ شوال ۱۲۲۲ھ تک صرف ڈھائی مہینے لکھنو میں رہے، لکھنو سے تقریباً ایک فرسخ کے فاصلے پر مولوی سید دلدار

---

(۱) ثمرات البدائع، مطبع محمدی، لکھنو، ۱۲۶۲ھ، ص ۱۱۴۔

علی مجتہد، ان کے فرزند اکبر مولوی سید محمد مجتہد، ملا محمد خطا شوستری کتاب خوان اور بہت سے مومنین نے قزلباشوں کی جماعت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ملا خطا کا حال بھی لکھا ہے۔ ان کو عالی جناب معلیٰ القاب، جامع الاوصاف والمحا، کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ نغز گفتار شاعر اور پسندیدہ اطوار مصاحب ہیں، عالموں اور شاعروں کی صحبت میں پرورش پائی۔ بے تکلف صحبتوں میں دوستوں کو ہنساتے ہیں اور نئی نئی باتیں سناتے ہیں اور امام حسینؑ کی مجلس عزا میں سنگین دلوں کو رلاتے ہیں یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو ہو جاتے ہیں۔ وہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو آئے اور ان کے امام باڑے میں روضہ خوانی پر ملازم ہو گئے۔ وہ اس وقت بھی لکھنو میں ہیں اور روضہ خوانی کی خدمت بڑی خوبی اور خلوص کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

۱۲۲۱ھ میں ان کے بھائی ملا حسن اور بیٹے میرزا علی عتبات عالیات سے لکھنو آئے اور اس وقت ان کی خدمت میں ہیں۔ یہ دونوں بڑے نیک اطوار اور خوش اخلاق ہیں۔

آغا محمد حسین بن آغا محمد علی اپنی کتاب اخبار ماتم میں لکھتے ہیں کہ ملا محمد خطا شوستری عہد آصفی میں لکھنو آئے اور وسعت بیان میں شہرت پائی۔ وہ کثیر التصانیف تھے۔ انہوں نے مصیبت کبریٰ نظم و نثر میں لکھی، بحر البکا ساٹھ دجلوں میں لکھنا چاہتے تھے، مگر سولہ دجلے (۱) شہادت حر تک لکھ چکے تھے کہ انتقال کیا۔ کتاب جہان نما سیر و تواریخ کی جامع تھی۔ یہ کتاب ملا خطا کے شاگرد منشی غلام مرتضیٰ نے ان کی بہو جیمس مارٹین کی بیٹی سے پانچ ہزار روپے دے کے لے لی۔

اجبار ماتم کے مصنف نے ایک جگہ واقعات کربلا کے بارے میں ضعیف اور بے بنیاد روایتوں کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے کہ شیرین کا امام حسینؑ کے اہل حرم کی مہمان داری کرنا اور ہند کا زندان شام میں آنا ملا محمد خطا کے بنائے ہوئے بہتان ہیں۔

---

(۱) کتاب کے نام بحر البکا کی مناسبت سے اس کا ہر باب ایک دجلہ قرار دیا گیا۔

مصنف اخبار ماتم کے والد ملا محمد علی کے استاد شاہ حسین اصفہانی جو خوش آواز اور بے مثال موسیقی داں تھے، عہد آصفی میں لکھنو آئے مگر آصف الدولہ کے استاد ملا خطا سے آزردہ ہو کر چلے گئے۔

ملا خطا کے شاگردوں میں مرزا محمد حسین، منشی غلام مرتضی، آقا نجف ترک، آقا مرزا، مرزا محمد علی اور شیخ جعفر روضہ خوان قابل ذکر ہیں۔ مرزا محمد حسین کے شاگرد میر حسین علی اور مرزا حمزہ علی تھے، منشی غلام مرتضی بد آواز تھے۔ ان کے شاگرد مرزا باقر بھی بدگلو تھے، مگر محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کو ان کا پڑھنا پسند تھا۔ آقا نجف کی آواز بلند اور تقریر متوسط تھی۔ انہوں نے جوانی میں انتقال کیا۔ آقا مرزا نے کانپور میں شہرت حاصل کی۔ مرزا محمد علی نابینا تھے، شیخ جعفر ملا خطا کا خادم تھا۔(۱)

مرآت الاحوال جہاں نما کے حوالے سے اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ملا خطا کے بھائی ملا حسن اور بیٹے مرزا علی ۱۲۲۱ھ میں لکھنو آئے۔ اخبار ماتم کے مصنف نے لکھا ہے کہ ملا خطا کے بھائی حاجی حسن بدگلو اور کثیر البیان تھے اور ان کے بیٹے مرزا محمد علی اور مرزا آقا علی قصہ خوانی کے طرز میں پڑھتے تھے۔ مرزا محمد علی مرزا غلام عباس کے شاگرد تھے اور پیشتر مرزا علی رضا شاگرد ملا محمد علی کتاب خوان سے بھی کچھ سیکھا تھا۔ اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ملا خطا کے بیٹے مرزا علی صواب اپنے باپ کے شاگرد، خوش آواز اور خوش خوان نوجوان تھے۔ ان کی بیوی جو جیمس مارٹین کی بدکار بیٹی تھی، اس نے اپنے آشناؤں کے بہکانے سے ان کو زہر دے دیا۔

نجم الغنی تاریخ اودھ میں لکھتے ہیں کہ نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت میں اقبال الدولہ جرنیل کے نائب تھے۔ بادشاہ ان پر بہت مہربان تھے۔ صبح کو خواب سے بیدار ہوتے تو ان کا منھ دیکھ کر اٹھتے تھے اور ہر وقت عیش و عشرت کے جلسوں میں ان کو شریک رکھتے تھے۔ ان کے فرائض منصبی کو منشی غلام مرتضی مرثیہ خوان پسر ملا محمد خطا روضہ خوان انجام دیتے تھے۔ غلام مرتضی بڑی خوش الحانی سے مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اقبال الدولہ کی عنایتوں سے انہوں نے بڑی شہرت اور بہت ثروت حاصل کی۔ (۲)

---

(۱) ماخوذ از بحر البکا۔　　(۲) تاریخ اودھ حصہ چہارم، ص ۲۳۸۔

اس بیان میں دو باتیں غلط ہیں، اخبار ماتم کے معتبر اور واقف حال مصنف کے حوالے سے اوپر لکھا جا چکا ہے کہ منشی غلام مرتضی ملا خطا کے شاگرد تھے بیٹے نہیں تھے، اور وہ بدگلو تھے، خوش الحان نہیں تھے۔

ملا خطا کی وفات:

ملا خطا نے ۱۲۲۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے مرزا علی صوابؔ نے قطعۂ تاریخ کہا جو ایک قدیم قلمی بیاض میں اس عنوان کے تحت درج ہے۔ ''تاریخ ملا محمد خطا من تصنیف پسرش مرزا علی صوابؔ مرحوم''۔

اس قطعے میں بائیس شعر ہیں، یہاں اس کے صرف ضروری اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

عمر چون عهد گلستان بی ثبات است ای ندیم	بی ثباتی شیوهٔ گل بوده از عهد قدیم
شارع دنیای فانی معبر سیل بلاست	هیچ عاقل در ره سیلاب نبود مستقیم
دوش در مرآت و هم از عکس تصویر خیال	تا سحر جان را مصور بود گلگشت نعیم
سایه گستر گشت طوبیٰ بر کنار سلسبیل	کوثر و تسنیم موج آورز تحریك نسیم
گشتم از روحانی سائل که این سامان چیست	گفت جنت را قرین گردیده فیضان عظیم
گفتش حکمت چه باشد گفت کاندر این مقام	گشته مداح حسینؑ امشب خطاؔ نامی مقیم
وقف عصیان خطاؔ گردیده نقد مغفرت	گشته از رحمت خریدار خطا رب رحیم
ای دریغ از بلبل دستان سرای اهل بیت	کو سبك برخاست از گلزار دنیا چون نسیم
گوهر ماتم ندارد بی رخ او آب و تاب	بی خطاؔ گردید طفل اشك تا محشر یتیم
سال تاریخش ز پیر عقل پرسیدم صوابؔ	روح پرور شد ز یك مصراع این بیت سلیم
لوح پر داز قضا بر تربت پاکش نوشت	"موطن ملا محمد شد بجنات النعیم"

(۱۲۲۹ سنہ ھ)

تصنیفات ملا خطا:

خطا کی چار تصنیفوں کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی دس بارہ ہزار اشعار کا دیوان، مصیبت کبریٰ، بحر البکا، جہاں نما، ان میں سے کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کی نظم ونثر کا ایک مجموعہ حاجی نواب محمد تقی علی خان کربلائی نبیرۂ نواب شجاع الدولہ نے مرتب کر کے ''واقعات ملا محمد خطا شوستری'' کے نام سے ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں مطبع نول کشور لکھنو میں چھپوایا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ میرے مطالعے میں رہ چکا ہے اور میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے مندرجات کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ مرثیہ چہاردہ بند، ص ۲-۸۔

۲۔ ہفت بند در بیان قتل عام سکنہ وزوار کربلائے معلیٰ، ص ۸-۱۱۔

۳۔ پیش خوانیان، ص ۱۱-۴۵۔

۴۔ واقعات وفات خاتم الانبیا، وفات حضرت فاطمہ زہرا، شہادت حضرت علی علیہ السلام، شہادت امام حسنؑ، وداع سید الشہدا از مدینہ، شہادت حضرت قاسم، شہادت جناب عباس، مراجعت اہل بیت از شام بہ مدینہ، شہادت علی اصغر، استقامت اہل حرم در ویرانۂ شام، ورود اہل بیت بہ مجلس یزید، ص ۴۶-۱۷۳۔

۵۔ دوازدہ بند در نعت، ص ۱۷۳-۱۷۸۔

۶۔ نوحہ جات، ص ۱۷۹-۲۱۷۔

۷۔ فاتحہ، ص ۲۱۷-۲۲۵۔

۸۔ مرثیہ بطریق خواندن اہل ہند، ص ۲۲۵-۲۳۰۔

۹۔ مرثیہ مخمس، ص ۲۳۰-۲۳۲۔

۱۰۔ واقعہ زن نصرانیہ، ص ۲۳۳-۲۴۱۔

۱۱۔ نوحہ جات، ص۲۴۲-۲۴۴۔

۱۲۔ فاتحہ بہر ترویج بعد خاتمۂ واقعات، ص۲۴۴۔

۱۳۔ قطعہ تاریخ برای وفات نواب آصف الدولہ۔

مرثیہ چہاردہ بند:

یہ ایک ترکیب بند مرثیہ ہے جو محتشم کے دوازدہ بند کے طرز پر کہا گیا ہے۔ اس کی بحر وہی ہے، ہر بند میں اشعار کی تعداد وہی ہے، بعض بندوں کا قافیہ و ردیف وہی ہے۔ بعض شعروں میں محتشم کے اشعار کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً خطاؔ کہتے ہیں:

ذات ملال اگر صفت ذو الجلال نیست　　عالم از اوپر است و جهان بی ملال نیست

اور محتشم کی بیت ہے:

هست از ملال گرچه بری ذات ذو الجلال　　او در دل است و هیچ دلی نیست بے ملال

اسی طرح خطاؔ کا ایک شعر مقبلؔ کے ایک شعر پر مبنی ہے، دونوں شعر لکھے جاتے ہیں:

خطاؔ: چون شاه دین ز خانهٔ زین بر زمیں فتاد　　گویا بخاك معركه عرش بریں فتاد

مقبلؔ: بلند مرتبه شاهی ز صدر زین افتاد　　اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد

ہفت بند:

یہ بھی ترکیب بند ہے ۔ ۱۲۱۶ھ میں عید غدیر کے دن یعنی ۱۸ ذی الحجہ کو وہابیوں نے کربلا میں قتل عام کیا تھا۔ یہی الم ناک واقعہ اس نظم کا موضوع ہے۔ اس کے آخری بند میں ایک شعر ہے:

تاریخ قتل عام شهیدانِ کربلا

دوران ز سال جز بغدیر آشنا نبود

اس شعر میں ''بغدیر'' مادہ تاریخ ہے جس کے عدد ۱۲۱۶ھ ہیں۔

پیش خوانیاں:

یہ بیشتر دس پندرہ شعروں کی مختصر نظمیں زیادہ تر غزل کی شکل کی اور دو تین مثنوی کی شکل کی ہیں۔ ایک پیش خوانی جو سب سے طویل ہے اس میں چھبیس شعر ہیں، ان نظموں کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اہل مجلس کو متوجہ کرنے کے لئے واقعات سے پہلے پڑھی جاتی تھیں۔ کئی پیش خوانیوں پر تصنیف کا سنہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ سنہ ۱۲۱۶ھ اور ۱۲۲۵ھ کے درمیان کے ہیں۔ پیش خوانیوں کے بیچ بیچ میں رباعیاں لکھ دی گئی ہیں، جن کی تعداد صرف پندرہ ہے۔

واقعات:

یہ ہیئت اور موضوع میں واقعات ملا مقبل سے مشابہ ہیں ان کی تعداد بارہ ہے، ان میں امام حسینؑ کی شہادت کسی واقعے کا موضوع نہیں ہے۔ یہ مرتبِ واقعات کی بڑی فروگزاشت ہے ورنہ یہ ناممکن ہے کہ خطاؔ نے اس حال کا کوئی واقعہ نہ کہا ہو۔

اس مجموعے میں واقعات کے علاوہ دو مرثیے اور ہیں ایک اٹھارہ بند کا ترجیع بند مخمس ہے اور ایک تیس بند کا مسدس ہے، جس کا عنوان ہے ''مرثیۂ فارسی بطریق خواندن اهل هند'' ایران میں مسدس مرثیے کا وجود نہ تھا، ہندوستان میں اس وقت اردو میں مسدس مرثیے کہے جانے لگے تھے۔ اس مجموعے میں تقریباً ستر نوحے اور دس فاتحے بھی شامل ہیں۔ مجلس ختم ہونے پر فاتحہ پڑھا جاتا تھا، یہ فاتحے نثر میں ہیں اور ان کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ فلاں بزرگ یا فلاں شہید کی روح پر مع کل پیشوایانِ دین کے فاتحہ۔ جس مخصوص بزرگ کی روح پر فاتحہ پڑھنا ہوتا تھا اس کے نام سے پہلے اس کے لئے توصیفی فقرے اس کثرت سے لکھے گئے ہیں کہ ہر فاتحہ سولہ سترہ سطروں کا ہو گیا ہے۔

ایک منظوم فاتحہ بھی ہے جو کسی غیر معروف اور کمتر درجے کے شاعر اشرفؔ کا کہا ہوا ہے۔

اس مجموعے میں بارہ بند کا ایک نعتیہ ترکیب بند بھی شامل ہے جو ملا کاشی کے مشہور ہفت بند کے طرز پر کہا گیا ہے۔

سب سے آخر میں وہ قطعۂ تاریخ ہے جو ملا خطاؔ نے آصف الدولہ کے انتقال پر کہا تھا۔

واقعات خطؔا میں کم سے کم ایک سو تیس اور زیادہ سے زیادہ تین سو سترہ شعر ہیں۔ جن ''واقعات'' میں واقعاتِ کربلا بیان کئے گئے ہیں، وہ سب ''محرم آمد'' سے شروع ہوتے ہیں اور جو ''واقعات'' وفاتِ رسالت مآبؐ، وفات حضرت فاطمہؑ، شہادت حضرت علیؑ اور شہادت امام حسن علیہم السلام کے بیان میں ہیں وہ سب ''عزائے کیست؟'' سے شروع ہوتے ہیں۔ ہر ''واقعے'' کے ابتدائی تمہیدی اشعار میں براعۃ الاستہلال کی صنعت ہوتی ہے، یعنی ان میں آنے والے واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

واقعہ وفات خاتم الانبیاء ﷺ:

عزای کیست که گردیده روز چون شب داغ		رود پیمبر آه از جگر سوئے معراج

واقعہ شہادت قرآن ناطق حضرت علی علیہ السلام:

عزای کیست که قرآن نشسته در ماتم		شده است حرف الف لام میم حرف الم

واقعہ وداع امام حسین۔ از مدینہ:

محرم آمد و از لعل پاره های جگر		گرفت قافلۂ اشك ساز راه سفر

واقعہ شہادت حضرت قاسم:

محرم آمد و آراست مجلس غم را		خطیب ناله بدل بست عقد ماتم را

تمہیدی اشعار کے بعد اصل واقعہ ''روایت است'' کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ واقعات کے آخر میں چند دعائیہ اشعار ہیں جن میں شاعر زیادہ تر اپنے گناہوں کی معافی اور اپنی بخشش کے واسطے اور کبھی کبھی عزاداروں اور عام مومنوں کے لئے دعا کرتا ہے۔ ایک واقعہ جس کا عنوان ہے ''واقعہ شہادت علی اصغر طفل معصوم حضرت امام حسین۔'' اس کے بارے میں خطا لکھتے ہیں:

بتاریخ سنه یك هزار و یك صد و نود و هفت این واقعه در کربلائے معلی با تمام رسید، بمحاذی ضریح مقدس در حضور پر نور مختص خداوندم؟ درخواست قبول

نمودم، در شب آن روز خاتم انبیاء ﷺ را در عالم رویا دیده عرض نمودم که در شهادت عبد الله اصغر چیزی عرض کرده ام بعد از تبیین مقالاتی چند که درمیان گذشت اجازت خواندن حاصل آمد باین صورت گفته بودم :

محرم آمد و از سیل گریۀ احباب　　بنایی هستی کون و مکان رسید بآب

اشارت شد در عین گریه که در حك و اصلاح اجازت هست؟ زمین عجز بوسیدم که سبب خواندن همین است. ارشاد فرمودند که "بنای هستی کون و مکان رسید بآب" دروغ است، اگر بآب رسیده بود بایستی که بعد از حسین نباشد، پس چنین بگو که" بنای هستی عیش جهان رسید بآب" که درین مصیبت عظمیٰ عالم کون و مکان را عشرتی باقی نمانده، صیحه زده بیدار شدم و بموجب فرمان واجب الاذعان "عیش جهان" نوشتم(۱)

(ترجمہ) ۱۱۹۷ھ میں یہ "واقعہ" کربلائے معلیٰ میں تمام ہوا۔ میں نے ضریح اقدس کے سامنے امام حسینؑ کے حضور میں اس کو پڑھا اور اس کو قبول فرمانے کی درخواست کی۔ اسی دان رات کو میں نے رسالتمآب کو خواب میں دیکھ کر عرض کیا کہ علی اصغر کی شہادت کے بارے میں کچھ عرض کیا ہے۔ کچھ گفتگو کے بعد پڑھنے کی اجازت حاصل ہوئی، میں نے یوں کہا تھا:

محرم آمد و از سیل گریۀ احباب　　بنایی هستی کون و مکان رسید بآب

گریہ کی حالت ہی میں دریافت فرمایا کہ ترمیم واصلاح کی اجازت ہے؟ میں نے زمین عجز کو بوسہ دیا کہ پڑھنے کی غرض یہی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ" بناءی هستی کون و مکان رسید بآب" جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو چاہئے تھا کہ حسینؑ کے بعد ان کا وجود نہ ہوتا، پس یوں کہو" بنائی هستی عیش جهان رسید بآب" کیونکہ اس مصیبت عظیم میں کون ومکان میں عشرت باقی نہیں رہی، میں

---

(۱) واقعات ملا محمد خطا ص ۱۴۵۔

ایک چیخ مار کر جاگ اٹھا اور آپ کے فرمان کے بموجب ''عیش جہاں'' لکھ لیا۔ اس واقعے میں دو سو چار شعر ہیں۔ کلام خطا کے نمونے کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

محرم آمد و از سیل گریۂ احباب	بنائے هستی عیش جهان رسید بآب
شد از معاملۂ شورش اناث و ذکور	مجاوران فلك را گمان نفخۂ صور
پی تدارك ماتم برنگ طرّه آه	سپهر کرده ز سر تا بپا لباس سیاه
مگو سپهر که آن دود مجمر دلهاست	در آن ستاره شراری ز اخگر دلهاست
ز دیده طفل سرشك ارفتد بخاك سزاست	چرا که ماتم فرزند سید الشهداست
روایت است که چون شمع محفل دارین	یگانه گوهر دُرج شرف امام حسینؑ
پس از شهادت خویشان بخویشتن نگریست	بسوز آتش دل زار چون کباب گریست
بسوی مقتل لب تشنگان نظر افگند	غروب کرده بخون دید آفتابی چند
بسوی محترمان حریم خود نگریست	ز تشنه کامی ایشان بسان ابر گریست
ازین مشاهده آبی بچشم تر گرداند	گسیخت عقد ثریا بر آفتاب افشاند
بچشم شاه ملائك سپاه عرش اورنك	فضای کون و مکان گشت چون دل او تنگ
گل ریاض امات چو غنچه لب بکشود	حریم محترم خویش را طلب فرمود
تمام ز آتش بی تابیش کباب شدند	بسان ذره روان رو بآفتاب شدند
سکینه گریه کنان بر امام تشنه لبان	کشور خانۂ آغوش را چو جسم بجان
همی نه در بر آن گوهر خوش آب رسید	جگر گداختۂ تشنۂ بآب رسید
چو طفل اشك بد امان آن جناب نشست	بزیر سایۂ خورشید ماهتاب نشست
بگریه گفت که ای گوهر محیط کرم	چو لاله داغ شد از تاب تشنگی جگرم
فسرده کشت حیاتم ز قحط آب شده	همین نه جسم ازین شعله جان کباب شده
جز از جناب تو چشمی به هیچ بابم نیست	ز ابر لطف تو جز آرزوی آبم نیست

ز برق حسرت آب روان روانم سوخت چو شمع ز آتش دل جسم نا توانم سوخت

کتاب حزن المومنین میں خطاؔ کا ایک مرثیہ غزل کی شکل کا ہے، جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

در شب قتل حسینؑ سر بگریبان زینبؑ داشت اندیشۂ فردای شهیدان زینبؑ

بخیال سر زلف علی اکبرؑ خوابید دید شب تا بسحر خواب پریشان زینبؑ

گهه نجات شهدارا ز خدا می طلبید گاه می کرد نظر جانب میدان زینبؑ

زرد می دید گل روی حسینؑ و عباسؑ اشك می ریخت چو باران بگلستان زینبؑ

گاه می آمد و از اشك سپندی می سوخت در بغل مجمره از سینۂ سوزان زینبؑ

بهر دامادی قاسم که عزا خواهد شد بود آشفته تر از زلف عروسان زینبؑ

گاه می گفت حرم را که دعا باید کرد تا نه بیند بجهان داغ عزیزان زینبؑ

گاه می دید رفیقان حسینؑ در خوابند شمع می برد ببالین عزیزان زینبؑ

گریه بر خنده و ذوق علی اصغرؑ می کرد یاد می کرد چو از غنچۂ پیکان زینبؑ

گاه می دید که با گریه حسینؑ می گوید می شود هم سفر لشکر عدوان زینبؑ

در قیامت بشفاعت که خطاؔ می بخشند می دهد مزد شما تعزیه داران زینبؑ

کتاب محیط العزا میں خطاؔ کے تقریباً پچیس مرثیے غزل کی صورت میں موجود ہیں۔

قاجاری عہد

قاجاری خاندان کا بانی آقا محمد خان قاجار ۱۷۹۶ء (۱۱-۱۲۱۰ھ) میں تخت نشین ہوا اور صرف پندرہ مہینے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین فتح علی شاہ نے ۱۷۹۷ء سے ۱۸۳۴ء تک سینتیس برس فرماں روائی کی۔ اس کے عہد میں فارسی شاعری کا احیا ہوا۔ وہ خود شاعر تھا اور اس نے اپنے گرد شاعروں کی ایک فوج جمع کر لی تھی۔ اس کے اڑھتالیس بیٹے بھی شاعر تھے۔ فتح علی شاہ کے بعد تیرہ چودہ برس محمد شاہ کی حکومت رہی۔ ۱۸۴۸ء میں ناصر الدین شاہ تخت پر بیٹھا اور ۱۸۹۶ء تک اڑھتالیس برس ایران پر حکومت کی۔ وہ بھی شاعر اور شاعروں کا سرپرست تھا۔ یہ تینوں بادشاہ عزاداری میں بڑا انہماک رکھتے تھے۔ فتح علی شاہ کے دور حکومت میں ایران کی عزاداری کا حال محمد حسین نے اپنی کتاب ''عذب البیان'' میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اسی کتاب سے مصنف کتاب کے تعارف کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

محمد حسین کے والد ملا محمد علی جو نسلاً ترک، اصلاً ایرانی اور مسکناً ہندی اور لکھنوی تھے، عتبات عالیات کی زیارت کے لئے خشکی کے راستے سے ۱۲۳۳ھ میں مشہد مقدس پہونچے اور وہاں سے طہران جا کر کچھ مدت قیام کیا، ۱۲۳۷ھ میں اپنے وطن تبریز گئے اور وہاں سے قزوین و ہمدان ہوتے ہوئے کرمان شاہ پہونچے۔ وہاں سے بغداد گئے اور ائمہ کے روضوں کی زیارت کر کے طہران واپس آئے۔ ۱۲۳۹ھ میں طہران سے روانہ ہوئے اور قم، کاشان، اصفہان، قمشہ اور شیراز ہوتے ہوئے

بوشہر پہونچے اور ۱۲۴۰ھ میں جہاز پر سوار ہو کر بمبئی پہونچ گئے۔ چند ماہ کے بعد وہاں سے کلکتے گئے اور کلکتے سے لکھنو واپس آ گئے۔

ایران میں ملا محمد علی کی بڑی عزت کی گئی۔ شاہ کے دربار میں باریاب اور خلعت اور خطاب خانی سے سرفراز ہوئے، ان کے آرام اور آسائش کا انتظام کرنے اور ان کا اعزاز اور احترام بجالانے کے لئے ولایتوں کے ناظموں اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کے نام شاہی فرمان جاری ہوتے تھے، ان کو شاہی مہمان کی حیثیت حاصل تھی۔ واپسی میں ان کے لئے شاہ کے حکم سے بوشہر کے بالیور، بمبئی کے گورنر اور ہندوستان کے وائسرائے کے نام خطوط لکھے گئے۔ یہ ملا محمد علی غالباً وہاں شیخ محمد علی روضہ خوان ہیں جنہوں نے ۱۲۵۷ھ میں مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے کتاب حزن المومنین تالیف کر کے امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے نام معنون کی۔ ایران اور عراق کے سفر میں محمد علی خان کے بیٹے محمد حسین ان کے ساتھ تھے۔ اس طرح ۱۲۳۳ھ سے ۱۲۴۰ ہجری تک (۱۸۱۸ء۔ ۱۸۲۵ء) سات برس ان کا قیام ایران میں رہا۔

ایران سے واپس آ کر محمد حسین نے ایک کتاب عذب البیان فارسی زبان میں لکھ کر نواب کلب علی خان والی رام پور کے نام معنون کی۔

یہ کتاب ۱۲۸۹ھ (۱۸۵۲ء) میں تمام ہوئی اور پہلی مرتبہ مطبع حسینی رام پور میں چھپی، دوسری مرتبہ ۱۹۲۴ء میں یہ کتاب مطبع آگرہ اخبار، آگرہ میں چھاپی گئی۔

رام پوری نسخے کے سرورق پر مصنف کا نام "محمد حسین بن محمد علی روضہ خوان" لکھا ہوا ہے۔ غالباً باپ کی طرح بیٹے کا پیشہ بھی روضہ خوانی تھا اور اسی لئے مراسم عزا سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کتاب میں ایران کی معاشرت اور رسم و رواج کا چشم دید حال بہت تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ذیل میں اسی کتاب سے ایران کی عزاداری کا بیان پیش کیا جا رہا ہے۔

قاجاری عہد میں عزاداری:

ایران میں مجلس عزا و ماتم کا سامان کرنے میں ہر حیثیت اور ہر طبقے کے لوگ شرکت کرتے

ہیں۔ کہیں ہر محلّہ کا ایک علیحدہ تکیہ (۱) اور کہیں دو تین محلوں کا ایک مشترک تکیہ ہوتا ہے۔ محلے کے خوش حال لوگوں میں سے ایک آدمی تنہا یا کئی آدمی مل کر ایک ایک شب و روز کے مصارف اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، جو تاریخ جس کے ذمے ہوتی ہے اس تاریخ کے ذاکروں، روضہ خانوں، شبیہ گردانوں، تعبیہ والوں کی اجرت اور قند، شکر، قہوہ، تمباکو، کوئلہ، لکڑی، کھانا، روشنی اور تمام ضروریات کا خرچ وہی دیتا ہے، اسی طرح پورا عشرۂ محرم گزر جاتا ہے غریب لوگوں میں سے ایک گروہ جھاڑو دینے، پانی چھڑکنے، فرش بچھانے اور اٹھانے کا ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ اور ایک جماعت کفش بردار، خدمتگار، شربت دار، باورچی، محافظ اور چوکیدار کے کام انجام دیتی ہے۔

تکیے کے صحن میں دیواروں سے دس پندہ گز زمین چھوڑ کر چاروں طرف رسیاں تان دیتے ہیں اور صحن کا درمیانی حصہ صاف اور خالی رکھتے ہیں۔ رسیوں کے ایک طرف مرد اور ایک طرف برقع پوش عورتیں بیٹھتی ہیں، بیچ کے میدان میں دو طرف چار پانچ گز مربع رقبے پر ایک دوسرے کے مقابل تخت بچھا دیتے ہیں۔ ایک جانب کے تخت امام حسینؑ کی طرف کے لوگوں کے لئے اور دوسری جانب کے یزید کی طرف کے لوگوں کے لئے ہوتے ہیں شبیہ گردانی کا استاد شبیہ بننے والوں کو حسب ضرورت تخت کے اوپر یا نیچے کھڑا کرتا ہے یا بٹھاتا ہے یا چلاتا پھراتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں کاغذ لئے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر سوال و جواب کے اشعار بلند آواز اور حسب حال لہجے میں پڑھتے ہیں۔ محلے کے

---

(۱) امام حسینؑ کی شہادت کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کے خوف سے پوشیدہ طور پر عزاداری کی جاتی تھی، بکتاش نامی ایک بڑا صوفی درویش تھا۔ روم اور ایران میں بہت سے لوگ اس کے مرید ہو گئے اور وہ بادشاہوں امیروں اور بزرگوں کا روشناس ہو گیا۔ اس نے بالاعلان عزاداری کرنے کے لئے بادشاہ سے اجازت کا فرمان حاصل کرلیا اور اپنے تکیے کو فقیری کے سامان سے آراستہ کر کے اپنے ہوا خواہوں کی جماعت کے ساتھ روز و شب مجلس عزا برپا کرنے لگا۔ اسی بنا پر جب عزاخانے کی عمارت کو اسباب و آلات سے آراستہ کرتے ہیں تو اس کو تکیہ کہتے ہیں۔ وہ ان مجلسوں میں مصائب سید الشہدا نظم و نثر میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ وہی طریقہ ذاکروں نے اختیار کرلیا۔ (عذب البیان مطبوعہ، رام پور، ص ۱۴۶، ۱۴۷۔)

حاجی بکتاش کی وفات ۷۳۸ھ مطابق ۸۔۱۳۳۷ء میں ہوئی۔ (تاریخ ادبیات ایران مصنفہ پروفیسر براؤن، جلد سوم، ص ۳۷۴)

مضبوط اور طاقتور لوگ انتظام میں مصروف رہتے ہیں کہ حاضرین شبیہ دیکھنے کے لئے بھیڑ نہ لگائیں، شور نہ مچائیں اور عورتوں کے گروہ سے الگ رہیں۔

تکیے کے شہ نشین میں عمدہ فرش بچھاتے ہیں اور اس کے مقابل صحن کی دوسری جانب بڑے بڑے تخت لگا کر اوران کے اوپر اور تین طرف پر تکلف پوششیں ڈال کر سقہ خانہ یعنی سبیل آراستہ کرتے ہیں۔ اس میں روشنی کا سامان اور شیشے کے قمقمے لٹکاتے ہیں اور بید مشک اور گلاب کے قرابے، ریحان کے گلدستے اور اگر سوز رکھتے ہیں۔ رات کے وقت کاغذ اور شیشے کی قندیلوں میں روشنی کرتے ہیں اور دن کو گلدانوں میں پھولوں کے گلدستے لگاتے ہیں اور عود سوز میں عود سلگاتے ہیں۔ تکیے کے صحن میں فرش بچھا کر ایک طرف منبر رکھ دیتے ہیں جس پر سیاہ پوشش پڑی ہوتی ہے اور عرشے کے دونوں جانب دو علم لگے ہوتے ہیں۔ امیر لوگ تکیے کے چاروں طرف کے طاقوں اور ایوانوں کو کشمیری شالوں، آئینوں اور تصویروں سے آراستہ کرکے اپنے خاندان والوں کے لئے جگہ مخصوص کر لیتے ہیں۔ بعض تکیوں میں پورے صحن پر شامیانہ لگا دیا جاتا ہے۔

ذیل میں ایام عزا کے ایک دن رات کی مصروفیتوں کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ پہلی محرم کو صبح سویرے ذاکروں کا دستہ تکیے میں آکر منبر کے نیچے حلقہ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ خاص ذاکر نے منبر کے زینے پر بیٹھ کر اپنے دمساز کے ساتھ ذکر شروع کیا۔ اس کے مقابل کے لوگ دم کشی کرتے رہے۔ وا شہیداہ اور یا حسینؑ، کی صدا سے سب لوگ باخبر ہو کر تکیے میں آنے لگے۔ بڑے بڑے اور ذی عزت لوگ شہ نشین میں اور اوسط درجے کے آدمی منبر کے گرد بیٹھ گئے۔ جب ذکر ختم کے قریب پہونچا تو ملائے روضہ خواں اپنے رفیقوں اور شاگردلڑکوں کے ساتھ دروازے سے داخل ہوئے اور خاص ذاکر کی جگہ پر بیٹھ گئے اور دو خوش آواز لڑکے منبر کے زینے پر برابر برابر بیٹھ گئے اور سب نے مل کر نوحہ خوانی کی۔ اس کے بعد ایک شخص نے منبر پر جا کر واقعاتِ ملا مقبلؔ اور ایک دوسرے شخص نے مرثیۂ ملا محتشمؔ کے بند پڑھے۔ ان کے بعد پیش خوان نے امام حسینؑ کے مصائب کے متعلق حدیثیں اور

روایتیں عربی اور فارسی نثر و نظم میں بیان کیں، اس کے بعد سب سے بڑے ذاکر ملا عبدالغنی کاشانی عرشہ پر جا کر بیٹھے اور پڑھنا شروع کیا۔ ذاکر دم کشی کرنے لگے، ملا صاحب نے اپنی دلپذیر تقریر، خوش الحانی اور موسیقی کے کمال سے مجلس کو متاثر کیا۔ حاضرین میں گریہ و نالہ کا خروش برپا ہوا۔ ایرانی بلند آواز سے نہیں روتے، چپکے آنسو بہاتے ہیں۔ مگر بیخودی کے عالم میں شیون کرنے لگتے ہیں۔ روضہ خوانی کے درمیان میں خدمتگاروں نے آکر سب لوگوں کو قہوہ پلایا، اور روضہ خوانی، نوحہ، دعا اور سلام کے اختتام پر شربت تقسیم کیا۔

اس اثنا میں عورتوں اور مردوں کا مجمع ہو گیا۔ تعبیہ گردانوں کا دستہ شبیہ کے سامان کے ساتھ آ گیا اور مختلف لہجوں سے سوال و جواب کی ایک مجلس پڑھی اور بانی مجلس کی تجویز کے مطابق جنگ کا ہنگامہ، شہادت کا منظر، خیموں کی تاراجی، اہل بیت کی اسیری، یا ابن زیاد اور یزید کے دربار کی سرگذشت حاضرین کو دکھائی، اس کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔ پھر ایک گروہ نے صف باندھ کر خوب نوحہ خوانی اور سینہ زنی کی۔ دن کے آخری حصے اور شام کو اور دستے دوسرے محلوں سے ایک علم لئے ہوئے آئے جس کا پنجہ بہت بڑا اور چھڑ بہت موٹی اور بھاری تھی اور جس پر کشمیری جامے دار اور خلیل خانی شال لٹکی ہوئی تھی۔ اس علم کو اپنے شانوں، دانتوں اور ماتھے پر اٹھا کر چاروں طرف پھرے اور صف کے آگے کھڑے ہو گئے اور قطار باندھ کر نوحہ پڑھ پڑھ کر ایسا ماتم کیا کہ زمین ہلنے لگی۔ اس کے بعد سب نے شربت پیا اور رخصت ہو گئے۔ ایک گھڑی رات گئے شرفا، علما اور صلحا جو شبیہ گردانی کے جلسے میں بلکہ روضہ خوانی میں بھی احتیاط کی راہ سے شریک نہیں ہوئے تھے، بانی مجلس سے وعدے کے موافق آنے لگے۔ جب مجمع ہو گیا تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر مصائب کا تفصیلی بیان واقعی سوز و گداز کے ساتھ حاضرین کو سنایا جس پر خوب گریہ ہوا۔ اس کے بعد قہوہ اور حقہ آیا پھر دستر خوان بچھا اور سب نے کھانا کھایا جو کھانا بچ رہا وہ نوکروں چاکروں نے کھایا اور باقی فقیروں کو دے دیا گیا۔ بالعموم عشرہ محرم میں اور کہیں کہیں صفر کے آخری عشرے میں مجالس عزا کے بعد کھانا کھلانے کا دستور ہے۔ محلے کے ذی

عزت اور خوش سلیقہ لوگ میزبانی، مہمانداری اور مجلس آرائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ غریب لوگ روشنی کرنے، کھانا کھلانے اور برتن دھونے کا کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔

ذی الحجہ کے مہینہ سے اچھی نسل کے ایک گھوڑے کو ذوالجناح کی شبیہ بنانے کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کو مجمعوں میں چلنے اور شور وغل برداشت کرنے کا عادی بناتے ہیں۔ عشرۂ محرم میں ساتویں سے دسویں تاریخ تک اس کو جلوس کے ساتھ نکالتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ زین ساز اور زیور سے آراستہ، قربوس پر کلاہ اور فولادی خود رکھا ہوا، پشت پر تنگ حلقوں کی زرہ پڑی ہوئی، بدن بھر پر تیر لگے ہوئے اور سرخ رنگ سے تلوار اور نیزے کے زخموں کے نشان بنے ہوئے، سر پر لجام پارہ پڑا ہوا، میر آخور اور غاشیہ بردوش سائیس اس کی باگ ڈور پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ جریدۂ (۱) فولادی اور چہل گیسو (۲) اس کے آگے آگے رکھتے ہیں اور چلچلی بجانے والوں اور نوحہ خوانوں کا ایک گروہ اس کے سامنے اور اردگرد چلتا ہے۔ جس محلے اور تکیے میں جاتے ہیں، خوب سینہ زنی کر کے سب کو رلاتے ہیں۔ شاہی تکیے میں شبیہ ذوالجناح کو خوب آراستہ کر کے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ لاتے ہیں۔

---

(۱) جریدہ، ابتدا میں آل رسول کے خون کا بدلہ لینے کے لئے مجاہدین دین شہیدوں کا اسباب ایک چھڑ میں باندھ کر مجمع کے آگے لے چلتے تھے۔ آج کل حباب کی شکل کے الگ الگ ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک پنکھا بنا کر لمبی چھڑ پر لٹکاتے ہیں اور اس کو عزاخانے میں پھراتے ہیں اور رکھ دیتے ہیں۔ (عذب البیان، مطبوعہ، رام پور، ص ۱۴۹، ۱۵۰)

(۲) چہل گیسو: درۃ الصدف بنت عبداللہ حلبی کے خروج کی علامت ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کربلا کے قیدی اور شہیدوں کے سر صنعائے یمن یا حلب کے قریب لائے گئے تو اس دیار کے محبان اہل بیت نے یہ مصیبت کا حال دیکھ اور سن کے بہت آہ وفغاں کی اور درۃ الصدف کی ترغیب وتحریص سے اس کی رشتے کی بہنوں اور اشراف کی بیٹیوں میں سے چالیس عورتوں نے لوازم عزا و ماتم کے طور پر اپنے گیسو کاٹ کے ایک علم پر لٹکائے اور اہل بیت کی حمایت میں جنگ کرنے لگیں۔ بہت سے مرد بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور دشمنوں پر حملہ کر کے شہید ہو گئے۔ اب اس واقعے کی یادگار میں کالے بالوں کو یا سیاہ ریشم کو بٹ کر گیسو کی شکل بنا کے ایک گول لکڑی کے گرد لٹکا کے اس کو ایک چھڑ پر لگا دیتے ہیں اور اس کو علم کی طرح اٹھاتے ہیں اور ماتم کے وقت گھماتے ہیں۔ (عذب البیان، مطبوعہ رام پور، ص ۱۵۰)

محرم کی دسویں شب کو سب لوگ شام سے صبح تک سونا اور آرام کرنا اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ بچے، جوان، بوڑھے جوق جوق علم لئے ہوئے شہر کے تکیوں میں جاتے ہیں۔ اپنے جاننے والوں کے یہاں نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتے ہیں۔ چائے اور حقہ پیتے ہیں اور دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک گروہ آتا رہتا ہے۔ اس رات کو اور عشرے کے دن تمام بازار میں اور دوکانیں بند رہتی ہیں۔ کھانے پینے کی کوئی چیز کسی طرح نہیں مل سکتی۔ عشرے کے دن ہزار ہا آدمی اپنی چندیا منڈوا ڈالتے ہیں تاکہ جب تلوار ماریں تو وہ سر میں اتر جائے۔ خون سر سے بہہ کر ان کی گردن اور چہرے پر جم جاتا ہے۔ بعض لوگ اپنے سینے پر پچھنے لگوا کر زخم اور خراش ڈالتے ہیں تاکہ ماتم کرنے میں خوب زخمی ہو جائیں۔

عشرے کے دن تکیوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ مگر بادشاہ اور شہر کے حاکم کے سامنے ایک بڑی شبیہ دکھائی جاتی ہے جس کی زیارت کے لئے ساری خلقت جمع ہو جاتی ہے۔ اس شبیہ میں اہل حرم کی سواری، کجاوہ و عماری، اعزہ و انصار، پیادہ و سوار کے ساتھ امام حسینؑ کا کربلا کی طرف جانا، راستے میں حر کا مع لشکر ملنا اور امام حسینؑ کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر ارض ماریہ کی طرف لے جانا، دشمنوں کی فوج کا پے در پے آنا، اصحاب و اعزہ کا ایک ایک کر کے لڑنا اور شہید ہونا، امام حسینؑ کی شہادت، لاشوں کی پامالی، اہلبیت کی اسیری، یہ سب واقعات دکھائے جاتے ہیں، اور یہ ہنگامہ طلوع آفتاب سے شروع ہو کر عصر کے وقت ختم ہو جاتا ہے۔

شاہی تکیے میں اس کے علاوہ اتنی بات اور دیکھی کہ اس کی شہ نشین کو جو توپ خانے کے میدان کے ایک طرف قبیلے کی سمت واقع ہے، سیاہ پوش کر دیا اور اس کے برابر ایک بڑا خیمہ لگا کر اس میں فرش بچھا کر ایک طرف منبر رکھ دیا اور اس کے مقابل دوسری طرف تخت بچھا کر بیل لگا دی، ظہر کے وقت روضہ خوانی اور اس کے بعد شبیہ گردانی ہوئی پھر قند کا شربت تقسیم کیا گیا۔ عصر کے وقت سب ذاکر، روضہ خوان اور تعبیہ گردان دیوان خانے کے اندر گئے۔ شاہ نے شہ نشین کے پہلو میں اوٹ کی آڑ میں

بیٹھ کر اور شاہزادوں اور مقرب خواصوں نے کسی گوشے میں بیٹھ کر خوانندگی سنی اور شبیہ گردانی کی زیارت کی۔ شام کو فراغت پا کر سب لوگ واپس گئے۔

عاشور کے دن صبح کے وقت جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، شاہ محزون و مغموم محل سے برآمد ہو کے علی قاپی کے پھاٹک پر خلوت گاہ میں تشریف فرما ہوا۔ بڑی شبیہ اس کے سامنے پیش کی گئی، ملا ابراہیم اور علی کندی امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی شبیہ بنے اور اپنے اپنے کاغذوں میں سے اشعار بلند آواز سے پڑھ کر حاضرین کو خوب رلایا۔ شبیہ کے ختم ہونے کے بعد ایک گروہ آیا جس نے اپنے سر اور سینے پر تلواریں مار کر نوحہ پڑھا اور بہت زور کا ماتم کیا۔ میدان میں ہر طرف ہزار ہا آدمیوں کا مجمع تھا، جس میں شہر کے لوگ رعایا اور سرکاری ملازم سب ہی تھے۔ اس دن شاہی حاجب کسی کے لئے روک ٹوک نہیں کرتے ہیں۔

اس بزم عزا کے برخاست ہونے کے بعد لوگ محلوں کے تکیوں میں چلے گئے۔ ایک گروہ زیارت پڑھنے کے لئے جنگل کی طرف نکل گیا اور عصر کے وقت واپس آ کر فاقہ شکنی کی۔ سب لوگ قبا اور پیراہن کے گریبان کھولے ہوے اور بعض اپنے گریبان چاک کئے ہوے، آستینیں الٹے ہوئے، ننگے سر، ننگے پاؤں تھے، جب ایک دوسرے سے ملتا تھا تو کہتا تھا ''یا لیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً''۔

مہندی کا سامان کرنا، تابوت بنانا، علم اور جریدے کھڑے کرنا، شیر مال، پنیر اور کباب کی حاضری کرنا، حلوہ پکا کر عزا خانے میں رکھنا، عاشور کے دن مسور کی دال اور چاول کھانا ایران کی رسم نہیں ہے، چاندی، لکڑی اور کاغذ کی ضریحیں اور تعزیے اور اس طرح کے علم اور زردوزی پٹکے جیسے ہندوستان میں ہوتے ہیں، ایران میں نہیں ہوتے، جھاڑ، جھابے، ہانڈیاں، دیوار، گیریاں، آئینے، مردنگیاں، کنول اور کیمپ جس کثرت سے ہندوستان میں، خاص کر لکھنو کے امامباڑوں میں ہوتے ہیں ایران میں نہیں ہوتے۔

عزاداری کے اس تفصیلی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجالس عزا، روضہ خوانی، سینہ زنی، تلواروں کا ماتم، علم اور ذوالجناح کے جلوس، شبیہ گردانی قاجاری عہد میں عزاداری کے خاص لوازم تھے اور عشرۂ محرم کے شب و روز انھیں مشاغل میں گزرتے تھے۔

قاجاری عہد میں مرثیہ گوئی:

مرثیے اس عہد میں بہت کہے گئے ہیں۔ قاجاری بادشاہوں نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور بعض بادشاہوں نے خود مرثیے کہے۔ قاجاری خاندان میں دو عظیم بادشاہ ہوئے۔ فتح علی شاہ اور ناصر الدین شاہ۔ فتح علی شاہ نے ۱۷۹۷ء سے ۱۸۳۴ء تک ۳۷ برس حکومت کی اور ناصر الدین شاہ نے ۱۸۴۸ء سے ۱۸۹۶ء تک ۴۸ سال فرماں روائی کی۔ ان دونوں کے درمیان میں تیرہ چودہ برس محمد شاہ کی حکومت رہی۔ یہ تینوں بادشاہ عزاداری میں بڑا انہماک رکھتے تھے۔ فتح علی شاہ اور ناصر الدین شاہ شاعر تھے اور مرثیے بھی کہتے تھے۔

فتح علی شاہ کا تخلص خاقاؔن تھا۔ راقم نے اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے جو ۳۱۴ صفحات اور مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ دیوان کا دیباچہ شاہ کے حکم سے محمد صادق خان مروزی نے لکھا ہے۔ جیسا کہ دیباچہ نگار کے مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

"رای عالم آرای مبارك شاهنشاهی به ترتیب و تدوین آن ملهمات غیبی و واردات لاریبی تعلق پذیرفته بکلب آستان فلك پاسبان محمد صادق مروزی که یکی از غلامان جان نثار آن خسرو گردون وقار است مقرر فرمودند که دیباچه بر این دیوان فصاحت بنیان نوشته باشد"۔

فتح علی شاہ کے دیوان میں چار مرثیے بھی ہیں۔ ان میں ایک دس بند کا ترکیب بند ہے اور تین مرثیے غزل کی شکل کے ہیں۔

ترکیب بند مرثیے کے چند منتخب بند اور غزل نما مرثیوں کے منتخب اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

(بند اول)

در حیرتم که چرخ چرا غرق خون نه شد — در ماتم حسینؑ زمین واژگون نه شد

چون آفتاب یثرب و بطحا غروب کرد — رخسار آفتاب چرا قیر گون نه شد

چون فخر کائنات نگون شد زپشت زین — بنیاد کائنات چرا سرنگون نه شد

افتاد آسمان امامت چو بر زمین — ساکن چرا سپهر و زمین بی سکون نه شد

جان جهان ز جسم جهان رفت و وین عجب — این جان سخت از تن یاران برون نه شد

آن تیره شب دریغ که در دشت کربلا — بر رهنمای خلق کسی رهنمون نه شد

خاقانؔ به ماتم شه دین گفت و فغان — معدوم از برای چه این چرخ دون نه شد

دردا که زندگی به دو عالم حرام شد — کین چرخ سفله دشمن دین را بکام شد

(بند سوم)

گردید بر سنان سر سلطان دین دریغ — افتاد آسمان شرف بر زمین دریغ

بر پیکر امام زمان زادهٔ زیاد — بکشاد صد هزار کمان از کمین دریغ

زینبؑ به نوحه گفت که از زادهٔ زیاد — منسوخ گشت دین رسول امین دریغ

در دست دشمنان و زبیداد آسمان — آل نبی اسیر و غریب و حزین دریغ

در آسمان به ماتم سلطان دین حسینؑ — تا حشر ذکر عیسی گردون نشین دریغ

آن آفتاب آل نبی بر زمین فتاد — گردش ز آسمان و سکون از زمین دریغ

تا جان به او سپار دو جان یگرداز... — خاقانؔ نه بود در صفِ آن دشت کین دریغ

واحسرتا که خانهٔ ایمان خراب شد — در ماتم تو سینهٔ عالم کباب شد

(بند ہشتم)

هر سو دلا به نیزه سر سروری به بین — غلطان بخاك و خون ز جفا پیکری به بین

گریان ز درد و داغ پدر کودکی نگر — دل ریش از فراق پسر مادری به بین

در ماتم برادر و از شدت عطش — مو یه کنان و موی کنان خواهری به بین

شور نشور روز قیامت شد آشکار — فریاد وا حسینؑ بهر کشوری به بین

آن خنجری که بوسه گه مصطفیٰ بُدی — از جور روزگار برو خنجری به بین

بر خرمن حیات جوانان هاشمی — از کینهٔ یزید لعین اخگری به بین

بر تشنگان آل نبی از جفای شمر — خاقانؔ بدشتِ کرب و بلا محشری به بین

روزی که بر سنان سر آن سروران زدند — آتش به پیکر همهٔ انس و جان زدند

آخری بند کے آخری دو شعر حسب ذیل ہیں:

چون از پئے شفاعت ما جان فدا نمود — خاقانؔ بدر گهه شه دین جان نثار باد

منت خدای را که فلك هست چاکرم — شاهنشه جهانم و مسکین این درم

میرے کتب خانے کی ایک قلمی بیاض میں بھی خاقانؔ کا یہ مرثیہ شامل ہے:

مرثیہ (۱)

محرم آمد و آغاز ماه ماتم شد — مهی که بارور از وی نهال هر غم شد

چرا که خم نه شود قامتم کامروز — زبار محنت و غم قد آسمان خم شد

به خالق دو جهان بندهٔ چنین زیبد — که خواجگی دو عالم به او مسلّم شد

برای ماتم آن شاهِ کربلا خاقانؔ — سر شلِكِ دیده ام از خون دل دما دم شد

مرثیہ (۲)

چرخ با صد چشم گریان حسینؑ — کائنات امروز قربان حسینؑ

بنگر از خون شهیدان آه آه — لاله زاری گشت میدان حسینؑ

انبیا و اوصیا در کربلا — می شوند امروز مهمان حسینؑ

کشته شد بهر شفاعت ورنه بود — گردش گردون به فرمان حسینؑ

اندرین ماتم تو ان گفتن یکی ست — حسرت خاقانؔ و حرمان حسینؑ

مرثیہ (۳)

امشب شب قتل پسر شیر خدا ست — امشب شب قتل نور چشم زہراؑ ست

جبریل بہ نوحہ گوید کہ فغان — امشب شب قتل بادشاہ شہداست

در ماتم شاہ دین حسین ابن علیؑ — از ہر طرفی شور و نشور و غوغاست

در ہر دوسرا شیون و شین است و فغان — امشب شب قتل سید ہر دوسراست

ارکان فلك بہ خویشتن می لرزد — در روی زمین شور قیامت برپاست

خاقانؔ بہ عزای شاہ دین اشك فشان — بر درد گنہ سر شك شور تو دواست

قاجاری خاندان کے دوسرے عظیم فرماں روا ناصر الدین شاہ کا تخلص ناصرؔ تھا۔ اس کی نظموں کا ایک بہت مختصر مجموعہ ایک دیباچے کے ساتھ "دیوان ناصری" کے نام سے میرزا محمد ملک الکتاب شیرازی نے شائع کیا تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل مرثیہ بھی شامل ہے۔

خنجر شمر بخون شہ خوبان تشنہ — خنجر شہ بدم خنجر برّان تشنہ

گفت شاہ شہیدا با پسر سعد لعین — آب در کوزہ روا داری و مہمان تشنہ

من چو خضرم و فرات است اگر آب حیات — خضر کی ماندہ بسر چشمۂ حیوان تشنہ

گبرو ترسا و نصاریٰ ہمہ زین آب خورند — بلب نہر جگر گوشۂ عمران تشنہ

کودکانم کہ ہمہ شہد و شکر می خوردند — حال طوطی صفت اندر شکرستان تشنہ

مہر زہراؑ بود این آب و ہمہ اولادش — کشتہ گشتند و فتادند بمیدان تشنہ

اکبرم کشتہ شد از تیغ شما در میدان — رفت در خلد برین شاہ جوانان تشنہ

دستہا از تن عباسؑ فگندند بخاك — کس ندیدہ است کہ سقّا سپرد جان تشنہ

آہ از آن لحظہ کہ اصغرؑ بسر دوش پدر — داد خنجر بدم غنچۂ پیکان تشنہ

دیو و دد جملہ ازین آب روان سیراب اند — کس ندیدہ است لب آب سلیمان تشنہ

ناصرا آب خوری یاد کن از شاہِ شہید
زان کہ شد کشتہ شہنشاہ شہیدان تشنہ

محمد عبد العلی کی تالیف ''حیات ناصر الدین شاہ ایران'' مطبع خادم الاسلام، دہلی میں ۱۸۹۷ء میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں ناصر الدین شاہ کا مندرجہ بالا مرثیہ بھی ہے اور ایک مرثیہ اور ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

مامور شد ز حضرت داوار جبرئیل — آمد بہ نزد سید ابرار جبرئیل

وقتی رسید دید تنش درمیان خون — گفتا فدای تو شده صدبار جبرئیل

عریان چو دیدنعش حسینؑ کرد سایه بان — شهیر به سبط احمد مختار جبرئیل

آهی کشید و سرور دین این خطاب کرد — خوش آمدی بدیدن دلدار جبرئیل

بردار شهپرت بگذارم که آفتاب — ساز و مرا به پیکر گلنار جبرئیل

رمزیست درمیان من و یار از ازل — واقف نه ای ز عالم اسرار جبرئیل

بردار شهپرت که شده موسم وصال — حائل مشو میان من و یار جبرئیل

رو کن به کربلا و ببین نعش اکبرم — سایه بکن به آن گل گلزار جبرئیل

بنگر تو جبرئیل که از جورِ کوفیان — شد کشته زار قاسم افگار جبرئیل

رو جبرئیل سایه بیفگن به زینبم — کامد سر برهنه ببازار جبرئیل

آن دم که در خرابه شود منزلش بشام — محتاج رو بسایۂ دیوار جبرئیل

آن دم که جبرئیل به لوح و قلم رسی

بر خوان تو شعر ناصرؔ قاجار جبرئیل

قاجاری بادشاہوں کے عہد حکومت میں کثیر تعداد میں مرثیہ گو پیدا ہوئے جن میں سے چند مرثیہ گویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نصیبی کرمان شاہانی:

میرزا محمد خاں نصیبیؔ ابن موسیٰ بیگ ایران کے شہر کرمان شاہان کا رہنے والا فتح علی شاہ قاجار کے عہد کا شاعر تھا۔ وہ اودھ کے حکم راں نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آیا اور فوج میں ملازم ہوگیا۔ غازی الدین حیدر نے بہت سے ایرانی جو مغل کہلاتے تھے اپنی فوج میں نوکر رکھتے تھے۔ ایک دن ایک مغل اپنی بیوی کو قتل کر کے تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے نواب کے در دولت پر پہنچا اور بے وقت دربار نواب کے پاس جانا چاہتا تھا۔ مگر دربان نے اس کو روک دیا۔ جب نواب کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو انہوں نے برہم ہو کر سب مغلوں کو برطرف کر دیا۔ صرف نصیبیؔ بدستور ملازم رہا۔ وہ ایران میں کسی کا خون کر کے ہندوستان چلا آیا تھا اور اپنے ملک کو واپس نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے اس نے یہیں کی سکونت اختیار کر کے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کر لی۔ جس سے اس کی اولاد بھی ہوئی۔ امجد علی شاہ کے عہد سلطنت (۱۲۵۳ھ۔۱۲۵۸ھ) میں اس نے انتقال کیا۔(۱)

نصیبی کی مثنوی لالۂ بوستان:

نصیبی کی مثنوی لالۂ بوستان کا ایک قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۲۹ھ میں تمام ہوئی، جیسا کہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہے:

زھجر نبی تا بہ آن روز و سال — کہ شد "لالۂ بوستان" سرخ و آل
فزون بست و نُہ بُدز الف و دوصد (۱۲۲۹ھ) — کہ کلکم کشیدے درین صفحہ مد

لالۂ بوستان میں حکایتوں کے ذریعے سے اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ بوستان سعدی کے طرز کی پیروی کی گئی ہے اور یہی اس مثنوی کی وجہ تسمیہ ہے۔ خود نصیبیؔ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کہتا ہے:

---

(۱) قیصر التواریخ، ج ا، ص ۲۳۳۔

و لیکن خجالت برم زین و آن	که این طرز را کرده سعدی بیان
فضو منش لاله کشتم در او	یقین نجردان را بود گفتگو
که این لاله در بوستان رسته بود	نه بشگفته چون غنچه سر بسته بود
فقیر حقیر اندر آن بوستان	شدم یك دو روزی تفرج کنان
چو دیدم که در بوستان لاله نیست	مهی هست و در گرد آن هاله نیست
فشاندم در آن تخمی و بار داد	ولی بار در فصل آزار داد

ذیل کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب نصیبی اپنے وطن کرمان شاہان میں تھا تو بہت سے اچھے اچھے شعر کہہ چکا تھا اور یہ مثنوی اس نے اثنائے سفر میں کہی:

اگرچه به کرمان شهانم سخن	بُدی پُر بها همچو دُرِّ عدن
ولی بهر مشغول اندر سفر	نمودم من این نظم ای داد گر

نصیبی نے ملکوں ملکوں کی سیاحت کی تھی۔ خاص کر روم، ایران اور ہندوستان کے مختلف مقامات دیکھے تھے۔ وہ خود کہتا ہے:

تفرج نمودم جهان را بسی	نشستم ابا هر کس و ناکسی
زهر پلۂ پا نهاده زبر	سیاحت نمودم همه بحر و بر
شدم مونس شهریاران روم	ز ایران بگشتم بسی مرز بوم
همه خطۂ هند را پازدم	نقاب از رخ شوق بالا زدم

یہ مثنوی نصیبی نے لکھنو میں تمام کی اور غازی الدین حیدر کے نام معنون کی جیسا کہ کتاب کے تمہیدی حصوں کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ خاص کر ان اشعار سے جو در وصف وزیر الممالک ہندوستان اور در مدح مرشد زادہ آفاق، کے عنوانوں کے تحت میں کہے گئے ہیں۔ ابتدائی شعر خاص طور پر قابل لحاظ ہیں:

نصیبیّ همیں لالۂ رنگ رنگ	بپاشید در عهد حکم فرنگ

بہ عہدی بہ ہندم فتادی گزار — کہ در آن نبودی کسی شہریار

کہ برنامش این نامہ انشا کنم — سرش از نُہ افلاک بالا کنم

نصاریٰ در آن ملک ہر حکم ران — مرا طبع راغب نشد مدح آن

بنام وزیر الممالک رقم — نمودی مرا طبع زرّین قلم

وزیری کہ از شہریاران تمام — بود شُہرہ چون مہر زرّین بنام

خداوند غازی دین حیدر است — کہ از قد راز نُہ فلک برتر است

اس مثنوی میں تقریباً پانچ ہزار شعر ہیں۔

میرے کتب خانے میں ایک نہایت خوش خط قلمی کتاب ہے، جس کے تمام مندرجات غازی الدین حیدر سے متعلق ہیں یعنی قطعات تاریخ جلوس، قصائد مدحیہ، قطعات تہنیت، خطوط بنام رزیڈنٹ، سلام و مرثیہ وغیرہ۔ اس کتاب میں چند نظمیں نصیبیؔ کی بھی ہیں۔ سینتالیس شعر کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ہزاران شکر کز دور سپہر و یاری اختر — مزین شد ز دارای جہان اورنگ اسکندر

اس قصیدے میں خاتمے کے قریب کہتا ہے:

فلک جاھا نصیبیؔ از دیار خود با میدی — نہادہ ہمچو حلقہ روی خود را جانب این در

گر از لطف تو امیدش روا گردد عجب نبود — کہ این در ہست درگاہ امید کہتر و مہتر

نباشد در فنون شاعری و از سر شوکت — نہ ہمچون من بعلم انوریؔ نی ہمچو تو سنجرؔ

ایک اُنیس شعر کا قطعہ موتی محل کی تعریف میں ہے جو غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۰ھ میں بنوایا تھا۔ ایک انتالیس شعر کا قصیدہ ماہ نوروز کی مبارکباد میں ہے، اس میں خود کو تمام درباری شاعروں سے بہتر قرار دیتا ہے۔

گرت مداح بسیار است اوصاف است بی پایان — ولی نبود یکی از آن ہمہ چون این سخن گستر

ایک پندرہ شعر کا دعائیہ قطعہ ہے جس کے یہ دو شعر قابل لحاظ ہیں:

شکر الله که زدیدار تو ای یوسف عصر گشت این پیره غلام تو دگر تازه جوان

آستان روبی تو بود نظر ورنه کجا می نهادم بیرون پای خود از کرماشان

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیبی اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا۔ دوسرے شعر میں وہ کہتا ہے کہ میں کرمان شاہان سے اسی لئے نکلا ہوں کہ آپ کی چوکھٹ پر جھاڑو دوں۔

نصیبی کی رثائی نظمیں:

فارسی مرثیوں کا مجموعہ جو نواب محمد تقی علی خان نے مرتب کر کے واقعات ملا مقبل وغیرہ کے نام سے مطبع نول کشور، لکھنو میں ۱۳۰۷ھ میں چھپوایا تھا اس میں نصیبی کی ساٹھ نظمیں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک میں محتشم کے مرثیے کی تخمیس کی ہے، ایک پانزدہ بند ہے، جس کے چودہ بندوں میں چہاردہ معصومین کی مدح کی گئی ہے اور آخری بند میں حضرت عباسؑ کی مدح ہے ایک سولہ بند کا مرثیہ محتشم کے مرثیہ دوازدہ بند کے جواب میں ہے۔ باقی سب پیش خوانیاں اور نوحے ہیں جو زیادہ تر غزل کی شکل کے ہیں۔ چند نوحے، مخمس اور مسدس ہیں۔ ایک نوحہ مثلث ترجیع بند ہے۔

دوازدہ بند محتشم کے ہر بند میں سر بند کے علاوہ سات شعر یعنی پورے مرثیے میں چوراسی شعر ہیں۔ نصیبی نے تیسرے اور چھٹے بند کا ایک ایک شعر چھوڑ کر باقی بیاسی شعروں کو مخمس کر دیا ہے اور یہ اس کی زود گوئی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ اتنے شعروں کی تخمیس ایک ہی دن میں کر دی، جیسا کہ اس کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے:

''هر گاه اربابان دانش ازین مخمس ایرادی یا نکتهٔ گیرند بی جاست نظر بآنکه در ششم محرم الحرام ۱۲۲۸ه در حیدرآباد دکن بحسب التجای دوستان در یك روز مخمس را تمام کرده به خوانندها داده شد، هرگاه چیزی بهتر به ذهن صاحبان شعور برسد تغییر و تبدیل بدهند که خالی از اجر نیست''۔

یعنی اس مخمس پر کوئی اعتراض کرنا بے جا ہے اس لئے کہ ۶ محرم ۱۲۲۸ھ کو حیدرآباد دکن میں

دوستوں کی خواہش پر ایک دن میں یہ مخمس پورا کر کے پڑھنے والوں کو دے دیا گیا تھا۔

اس مخمس کا پہلا بند نقل کیا جاتا ہے:

باز این چه ناله است که با آه توام است — باز این چه گریه است که هر دیده پرنم است

باز این چه فتنه است کزو دهر درهم است — باز این چه شورش است که در خلق عالم است

باز این چه نوحه و چه عزا و چه ماتم است

نصیبی نے مرثیۂ محتشم کے جواب میں جو مرثیہ کہا ہے وہ کمیت میں محتشم کے مرثیے سے بڑھ گیا ہے۔ محتشم کے مرثیے میں آٹھ آٹھ شعر کے بارہ بند ہیں اور نصیبی کے مرثیے میں دس دس شعر کے سولہ بند ہیں۔ لیکن کیفیت کے اعتبار سے وہ محتشم کے مرثیے کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ اس مرثیے میں محتشم کی پیروی کے آثار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ پہلا بند اسی طرح چند سوالوں سے شروع ہوتا ہے۔ کئی بندوں میں قافیہ اور ردیف وہی ہے، ایک بند کے چند شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں اور ان کے سامنے محتشم کے وہ شعر رکھے جاتے ہیں جن کا عکس ان شعروں پر صاف نظر آتا ہے:

نصیبی	محتشم
ترسم چو فرد قاتل او را برون کنند	ترسم جزای قاتل او چون رقم زنند
یکباره خلق را به سقر سرنگون کنند	یکباره بر جریدهٔ رحمت قلم زنند

☆ ☆☆☆ ☆

نصیبی	محتشم
از شرم شافعان چو قیامت کند قیام	ترسم کزین گناه شفیعان روز حشر
با این عمل شفاعت احباب چون کنند	دارند شرم کز گنه خلق دم زنند

☆ ☆☆☆ ☆

نصیبی	محتشم
آه از دمی که خیل شهیدان به جسم چاك	آه از دمی که با کفن خون چکان ز خاك
شکوه ز کوفیان دنی طبع دون کنند	آل نبی چو شعله آتش علم زنند

☆ ☆☆☆ ☆

نصیبی	محتشم
فریاد از آن زمان که ز پیراهن حسینؑ	فریاد از آن زمان که جوانان اهلبیت

صحرای حشر را چو چمن لالہ گون کنند   گل گون کفن بہ عرصۂ محشر قدم زنند

بیدلؔ کرمان شاہانی:

مرزا حاجی محمد ابن میرزا علی محمد اصل میں مازندران کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد جو دولت شاہ کے خواص تھے، ان کو شیر خوارگی کے زمانے سے کرمان شاہان لے گئے۔ وہیں انہوں نے عربی وادبی علوم کی تحصیل وتکمیل کی اور اپنے والد کے بعد آتش خانے اور فوج کی سررشتہ داری اور مباشری کے منصب پر فائز ہوے۔ تذکرہ مجمع الفصحا کی تالیف کے وقت بھی وہ کرمان شاہان کی ایک فوج کے مباشر تھے اور وہاں کے شعرا کے استاد تھے۔ تذکرہ مجمع الفصحا کے مولف کا بیان ہے کہ بیدلؔ قوت طبع، قدرت خاطر، حسن اخلاق اور صدق نیت میں بے نظیر ہیں۔ بہت سے مرثیے کہے ہیں اور ایک کتاب ''دستان ماتم'' تین جلدوں میں لکھی ہے۔ مولف مجمع الفصحا نے اس کتاب کی دو جلدیں پڑھی تھیں۔ ان کی رائے میں وہ کتاب نہایت امتیاز رکھتی تھی۔ بیدلؔ نے عروض قافیے میں ایک رسالہ بھی لکھا اور ایک مثنوی، معسر ویسر، تصنیف کی جس میں حکایات ''فرج بعد الشدت'' اور نصائح پسندیدہ نظم کئے۔ (۱)

مجمع الفصحا میں بیدلؔ کے قصائد وغزلیات کے اشعار نقل کئے گئے ہیں مگر کسی مرثیے کا ایک شعر بھی نہیں ہے۔

مرزا محمد تقی صاحب وصاحب دیوان:

دیوان وصالؔ شیرازی مطبوعہ ایران کے آخر میں دیوان میرزا تقی علی آبادی بھی شامل ہے۔ یہ دیوان کاہے کو ہے کلیات ہے۔ شروع میں کچھ نثری تحریریں بھی ہیں۔ پہلی تحریر میں ۱۲۰۵ھ عہد فتح علی شاہ کے ایک واقعے کا ذکر ہے۔ مرزا محمد تقی غزلوں میں زیادہ تر صاحبؔ اور کم تر صاحب دیوانؔ تخلص

---

(۱) مجمع الفصحا، جلد دوم، ص ۷۵۔

لاتے ہیں۔ان کی پہلی غزل میں فتح علی شاہ کی تعریف میں ایک شعر موجود ہے۔دیوان صاحب دیوان میں ایک طولانی قصیدہ ''در ماتم حضرت سید الشہدا'' ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

دی شام زرہ شور عزائی بدر آمد کز آمدنش جان بلب و دل بسر آمد

ایک دوسرا قصیدہ در ماتم حضرت حسینؑ ہے اس کا مطلع یہ ہے:

ای در نبرد حیدرؑ کرار روزگار در صدر شرع احمد مختارؐ روزگار

ان دو مرثیوں کے علاوہ تین چار نظمیں مثنوی کی شکل کی ہیں جن میں واقعات کربلا اور ماہ محرم کا ذکر ہے۔

دو منظوم حکایتیں ہیں۔ایک فتح علی شاہ کی زندگی میں اور ایک ان کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی۔ان چیزوں سے مصنف کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔پہلی حکایت کا پہلا شعر یہ ہے:

شنیدم ز فتح علی شاہ راد کہ بی بخت او تخت شاہی مباد

دوسری حکایت کے ابتدائی چند شعر حسب ذیل ہیں:

چو چل سال فتح علی شاہ گرد جہان را بشاہی و شادی سپرد

بسیج رہ آن جہان ساز کرد روان را بیاد حق انباز کرد

یکی دخمہ آراست بر خاک قُم کہ رحمت ابر تربت پاک قم

بفرمود سنگی ز تمثال شاہ نہادند بر آن شہی خوابگاہ(۱)

وصالؔ شیرازی:

تذکرہ مجمع الفصحا کے مولف کا بیان ہے کہ وصالؔ شیرازی کا نام میرزا شفیع تھا۔مگر وہ میرزا کوچک کے نام سے مشہور تھا۔خطاطی کا ماہر اور خط نسخ کا مسلم استاد تھا۔جوانی میں نہایت خوبصورت اور خوش آواز تھا،حاجی میرزا ابوالقاسم شیرازی سے ارادت رکھتا تھا اور ان کے اکابر اصحاب میں شمار

(۱) قصبہ شاہ عبدالعظیم بن ناصر الدین شاہ قاجار کی قبر پر بھی بادشاہ کا سنگی مجسمہ فوجی لباس میں محو خواب ہے۔

ہوتا تھا۔ کمالات روحانی بھی حاصل کیئے تھے، شیراز میں اس کی محفل ارباب کمال اور اصحاب حال کا مجمع تھی، فنون نظم میں ماہر تھا، خاص کر غزل سرائی میں شعرائے فارس کا استاد اور اس مملکت کے خوشنویسوں میں اکمل تھا، وحشی کی مثنوی فریاد و شیرین کا تکملہ لکھا اور ایک مثنوی بزم وصال خود تصنیف کی، اس کے دیوان میں پندرہ ہزار بیتوں سے زیادہ ہیں، آخر عمر میں صدمات روزگار سے خانہ نشین ہو گیا تھا۔ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ جس زمانے میں میرا قیام فارس میں تھا ان کی صحبت اکثر میسر ہوتی تھی۔ (۱)

مولف تذکرہ نے وصالؔ کے قصیدوں اور غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے، جس میں ایک قصیدے کے کچھ شعر ہیں جو وصال نے ہندوستان بھیجا تھا اور ایک دوسرے قصیدے کے کچھ شعر ہیں جو راجا چند ولال وزیر دکن کی مدح میں کہا گیا تھا۔ مولف تذکرہ نے نہ وصالؔ کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے نہ ان کے مرثیے کا کوئی نمونہ پیش کیا ہے۔

میرزا علی اکبر شیرازی مولف تذکرہ دل کشا وصالؔ کا ہم عصر تھا۔ اس نے وصالؔ کو شاعری میں عدیم المثال اور موسیقی اور خطاطی کا ماہر بتایا ہے۔ پروفیسر براؤن نے وصالؔ کو انیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعروں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے حاجی میرزا یحیٰ دولت آبادی سے جو فارسی شاعری کا حد درجہ وسیع علم رکھتے ہیں اور جن کو فارسی کے ہزارہا شعر یاد ہیں، دریافت کیا کہ تذکرہ مجمع الفصحا میں جن تین سو انسٹھ معاصر شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے کون کس پایے کا ہے، تو انہوں نے صرف پانچ یعنی صباؔ کاشانی، فروغیؔ بسطامی، قاآنیؔ شیرازی، مجمرؔ اصفہانی اور نشاطؔ اصفہانی کو اول درجے کا اور دو یعنی وصالؔ شیرازی اور مولف تذکرہ ہدایتؔ طبرستانی کو دوسرے درجے کا اور دو یعنی سروشؔ اصفہانی اور وقارؔ شیرازی کو تیسرے درجے کا شاعر قرار دیا۔

---

(۱) مجمع الفصحا، جلد دوم، ص ۵۲۸۔

وصالؔ ایک شاعر خاندان کا بانی تھا۔ اس کے چھ بیٹے شاعر تھے۔ جو وقارؔ، حکیمؔ، فرہنگؔ، داوریؔ، یزدانیؔ اور ہمتؔ تخلص کرتے تھے، ان کی اولاد میں بھی بہت سے شاعر ہوے۔

وصالؔ اپنے عہد کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہور و مقبول مرثیہ گو تھا۔ اس کے مرثیے اس کے ضخیم مطبوعہ کلیات میں بھی شامل ہیں اور ان کا مجموعہ علیحدہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے دو ایڈیشن میرے کتب خانے میں ہیں۔ ایک میں نے اگست ۱۹۳۳ء میں اصفہان میں خریدا تھا، جو غالباً وہیں کا چھپا ہوا بھی ہے۔ دوسرا ایڈیشن جو اسی کی نقل معلوم ہوتا ہے بمبئی کا چھپا ہوا ہے۔ مگر میں نے اس کو وصالؔ کے وطن شیراز میں اسی زمانے میں خریدا تھا۔ یہ دونوں ایڈیشن بہت غلط چھپے ہیں۔ ان میں وصالؔ کے بیس پچیس مرثیے شامل ہیں۔ ان میں صرف سات آٹھ مرثیے ایسے ہیں جو ترجیع بند، مثنوی، قصیدہ اور مخمس کی شکل کے ہیں۔ باقی سب مرثیے ترکیب بند ہیں۔ جن میں ایک محتشم کے مرثیے کا جواب ہے۔ اصفہانی ایڈیشن کے آخر میں چند مرثیے دوسرے شاعروں کے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

وصالؔ کے ضخیم مطبوعہ کلیات میں اس کے مرثیے بھی ہیں اور کتاب حزن المومنین کا مطبوعہ نسخہ جو میرے مطالعے میں رہا ہے اس کے صفحہ ۷ سے صفحہ ۲۲۰ تک حاشیے پر وصالؔ کے مرثیے درج کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے ان دونوں کتابوں میں مندرج مرثیوں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ حزن المومنین میں آخری تین مرثیے ایسے ہیں جو کلیات وصالؔ میں نہیں ہیں۔ ان تین مرثیوں میں ایک شیخ سعدیؔ کی فارسی عربی غزل کی تخمیس ہے جس میں نو بند ہیں۔ آخری دو بندوں میں وصالؔ کا تخلص موجود ہے۔ سعدیؔ کی اس غزل کے بعض شعروں میں پہلا مصرع عربی اور دوسرا فارسی ہے۔ لیکن زیادہ شعروں میں پہلا مصرع فارسی اور دوسرا عربی ہے۔ دوسرا مرثیہ مخلوط نظم و نثر میں ہے مگر نظم نثر سے زیادہ ہے۔ اس میں شاعر کا تخلص موجود نہیں ہے۔ تیسرا مرثیہ قصیدے کی شکل کا ہے۔ اس میں کل ۲۳ شعر ہیں۔ مطلع اور مقطع درج ذیل ہے۔

مطلع:

بس که از دست فلك خونین دلم شوریده حلم　　جوی کون اندر مشامت آید ارخوانی مقالم

مقطع:

ای امام راستان چون با تو شد کار شفاعت　　در بر داور بگو کز دوستان باشد وصالم

کلیات وصالؔ میں ایک ترکیب بند مرثیہ ۱۸ بندوں کا ہے۔ حزن المومنین میں یہ نظم دو مرثیے قرار دی گئی ہے۔ پہلا مرثیہ ۷ بند کا اور دوسرا گیارہ بند کا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مولف حزن المومنین نے دوسرے مرثیے کے عنوان پر ''فی جواب المحتشم'' لکھا ہے (ص ۱۳۵) یہ بھی صحیح ہے۔ مراثی وصالؔ کے مطبوعہ نسخوں میں بھی یہ مرثیہ محتشم کے مرثیے کا جواب قرار دیا گیا ہے۔ مطبوعہ کلیات وصال میں اس مرثیے کے گیارہویں یعنی آخری بند میں سر بند لکھنے سے رہ گیا ہے مگر حزن المومنین میں موجود ہے جو حسب ذیل ہے:

ترسم که شکوهٔ تو چو در محشر آورند　　خلق زمانه را همه در کیفر آورند

اس مرثیے کا مطلع یہ ہے:

تیغی کشیده چرخ مگر زخم ما کم است　　گو جای زخم نیست که هنگام مرهم است

وصالؔ کا ایک مرثیہ اور ہے جس میں کل نو بند ہیں۔ اس کے ابتدائی تین بند بھی یقیناً محتشم کے تین بندوں کے جواب میں کہے گئے ہیں۔ ان تینوں بندوں کے ابتدائی شعر ترتیب وار درج ذیل ہیں:

در جیب عالمی ز عزا چاكِ ماتم است　　یارب عزای کیست که منسوب عالم است

☆☆☆☆☆

شاه بلند افسر میدان کربلا　　نوح شکسته زورق طوفان کربلا

☆☆☆☆☆

آنانکه بر الست خروش بلا زدند　　پروانه وار خویش به شمع بلا زدند

محمد حسن ابن حاجی معصوم قزوینی نے مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے ایک نہایت ضخیم کتاب ریاض الشہادہ لکھی جو تین جلدوں میں ہے اور تیس مجلسوں پر مشتمل ہے اس کتاب کی تالیف کے وقت فتح علی شاہ قاجار ایران کا بادشاہ اور شاہزادہ حسین علی میرزا فارس کا فرمان روا تھا، یہ کتاب فتح علی شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس کا جو نسخہ میں نے دیکھا ہے وہ حاجی محمد ہاشم خان غازی کی فرمائش اور شیخ عبدالوہاب کے اہتمام سے چھپا تھا، پہلی اور دوسری جلد ۱۲۷۳ھ میں اور تیسری جلد ۱۲۷۴ھ میں چھپ کر تیار ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جلد سوم کے حاشیے پر ص ۲۲۵ سے ص ۳۲۰ تک وصال شیرازی کے مرثیے اور ص ۳۲۱ تک وقار شیرازی کے مرثیے درج ہیں۔

ان میں وصال کا مرثیہ محتشم کاشی کے دوازدہ بند کا جواب بھی ہے۔

وصال نے درج ذیل مرثیہ ایک خاص التزام کے ساتھ کہا ہے:

شنیدہ اید حسینی بکربلائے بود	شنیدہ اید کہ از خون محاسنش آلود
ندیدہ اید کہ چندیں ہزار زخم چہ کرد	ندیدہ اید کہ چندین ہزار درد چہ بود
شنیدہ اید کہ طفلی زنا و کی جان داد	ندیدہ اید رگ خون زدیدہ کہ کشود
شنیدہ اید تنی پائمال اسپان شد	ندیدہ اید لکد کوب غم کرا فرسود
شنیدہ اید علمداری او فتاد ز پا	ندیدہ اید کہ پشت کرا شکست حسود
شنیدہ اید عروسی بحجلہ بست سیاہ	ندیدہ اید بچشم کہ شد زمانہ کبود
شنیدہ اید بہ زنجیر رفت بیماری	ندیدہ اید رہ شام را چسان پیمود
شنیدہ اید خلیلی در آتش و تب بود	ندیدہ اید مسیحی اسیر قوم یہود
شنیدہ اید عیالی ز کوفہ رفت بشام	ندیدہ اید اسیری بہر کسی چہ نمود
شنیدہ اید کہ آتش بخیمہ افتاد	ندیدہ اید بچرخ از دل کہ برشد دود
ہمہ اذیت پیغمبر است بلکہ خدای	کہ من اذانی از ان روی مصطفی فرمود(۱)

خاکی شیرازی نے بھی اسی طرز کا ایک مرثیہ کہا ہے جس کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

شنیده اید حسینی بظلم گشت شهید　　شنیده اید که چشم سپهر خون بارید
ندیده اید که دارد فلک لباس سیاه　　ندیده اید که انجم ز گریه دیده سفید

پورا مرثیہ خاکی کے ذکر میں نقل کیا جائے گا۔

محرؔم یزدی:

میرزا عبدالوہاب محرم ابن میرزا محمد علی محرؔم ایک ذی علم شخص تھے۔ زبان فرانسیسی بخوبی جانتے تھے۔ یزد میں پیدا ہوئے۔ تکمیل علوم کے بعد عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے اور کچھ دن کرمان شاہان میں قیام کیا۔ اس کے بعد طہران آئے اور محمد شاہ قاجار کے درباری شاعر ہو گئے۔ بادشاہ مذکور ان پر بہت عنایت کرتا تھا چنانچہ ان کو ملک الشعراے عراقین، کا خطاب عطا کیا۔ تذکرہ مجمع الفصحا کی تالیف کے وقت طہران کے مدرسۂ دارالفنون میں معلم فرانسیسی تھے اور دنیا کی ہوا و ہوس سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اور گزشتہ مدائح ناواجب کے کفارے میں مدح و منقبت حضرت رسولؐ اور مرثیہ امام حسینؑ کہتے تھے، متعمد دمسمّط مرثیے کہے۔ جن میں سے ایک مرثیہ مولف مجمع الفصحا نے نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ مسبّع مسمط ہے اور اس میں ۴۸ بند ہیں۔

پہلا بند حسب ذیل ہے:

چون شاه یثرب هوس کرب و بلا کرد　　در کرب و بلا خیمۀ اجلال بپا کرد
بنمود بحق وعده بر وعده وفا کرد　　سلطان بحق بود و حق خویش ادا کرد
در کشته حکم همایون بقضا کرد　　هم کار شفاعت ز پی قرب خدا کرد

قربی که تو عاجز شوی از ترجمۀ آن

اس مرثیے میں انصار و اعزہ کی شہادت مختصراً بیان کر کے حضرت علی اکبرؑ کی رخصت، جنگ اور شہادت کسی قدر تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس بیان کے ابتدائی تین بند نقل کئے جاتے ہیں:

---

(۱) حزن المومنین، ص ۳۱۷۔

عشق آمد و زد خیمه بر از طارم اخضر | کز خیمه چو خورشید بر آمد علی اکبر
ای آنکه توئی عاشق دیدار پیمبر | بنگر به علی علوی حضرت اکبر
معشوق گرامی پسر عاشق داور | مثل اسد الله بود و شبهه پیمبر
از عزت لله از ین فخر و از این فر | بر دور پدر گشت پس از رخصت مادر
نالید که ای خسرو بی ناصر و یاور | ما ناصر حقیم و بحق ناصر ایمان
چون اهل حرم نالهٔ شهزاده شنیدند | از خیمه برون آمده زی شاه دویدند
چون سروو مه آن قامت و رخساره بدیدند | یکباره سر انگشت تحیر بگزیدند
گفتند سخن باوی و پاسخ بشنیدند | و ز فرقتِ شهزاده به تن جامه دریدند

سخت است بلی فرقت جان دوری جانان

افشاند یکی بر گل رخساره گلابش | زد شانه یکی سنبل پر حلقه و تابش
آورد یك از پردگیان اسپ عقابش | رخ سود بخاك قدم حضرت بابش
پرسید بسی نکته و شه داد جوابش | کز کار شفاعت چو رسد روز حسابش

در خدمت پیغمبر و در حضرت رحمان(۱)

مولف مجمع الفصحا نے محتشم کاشانی کے علاوہ کسی مشہور مرثیہ گو کا کوئی مرثیہ نقل نہیں کیا بلکہ اس کی مرثیہ گوئی کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مگر محرم یزدی کی مرثیہ گوئی کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کا ایک طولانی مرثیہ نقل بھی کیا ہے۔ حالانکہ وہ مرثیہ کسی خاص خوبی یا غیر معمولی تاثیر کا حامل نہیں ہے۔ معلوم نہیں محرم کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی ہے۔

قاآنی شیرازی:

میرزا حبیب قاآنی ۱۲۲۲ھ کے قریب شیراز میں پیدا ہوا اور ۱۲۷۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

---

(۱) مجمع الفصحی، ج۲، ص ۴۵۷، ۴۶۱۔

قاآنی ایک بہت ذی علم شخص اور قاجاری عہد کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور تھا اور الفاظ کا لامتناہی ذخیرہ اس کے قبضے میں تھا، جس سے کام لے کر وہ اپنے کلام میں حیرت خیز ترنم پیدا کر دیتا تھا، مثال میں اس کے ایک قصیدے کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئبار ها   که بوی مشك می دهد هوای مرغزارها

فراز خا و خشتها دمیده سبز کشتها   چه کشتها بهشتها نه ده نه صدهزارها

ز ریزش سحابها بر آبها حبابها   چو جوی نقره آبها روان در آبشارها

درین بهار دل نشین که گشته خاك عنبرین   زمن ربوده عقل و دین نگارے از نگارها

رفیق جو شفیق خو عقیق لب شقیق رو   رقیق دل دقیق مو چه موز مشك تارها

دو کوزه شهد برلبش دو چهره ماه نخشبش   نهفته زلف چون شبش به تارهاتتارها

قاآنی نے ایک مرثیہ بالکل نئی طرح کا کہا ہے جس میں واقعات کربلا سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دئے ہیں اور بیان میں اتنا اختصار برتا ہے کہ ایک ایک مصرع میں کئی کئی سوال مع جواب سما گئے ہیں اس مرثیے میں ۳۲ شعر ہیں۔ چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

بارد چه؟ خون که؟ دیده، چسان؟ روز و شب، چرا؟   از غم، کدام غم؟ غم سلطان کربلا

خون شد؟ شهید شد، به کجا؟ دشت ماریه   کی؟ عاشر محرم، پنهان؟ نه، برملا

سیراب کشته شد؟ نه، کس آبش نداد؟ داد   که؟ شمر، از چه چشمه؟ ز سر چشمه فنا

مظلوم شد شهید؟ بلی، جرم داشت؟ نه   کارش چه بُد؟ هدایه، و یارش که بُد؟ خدا

کس کشته شد هم از پسرانش؟ بلی دو تن   دیگر پسر نداشت؟ چرا داشت، آن که بود؟

حاد، چون بُداو؟ بغم و رنج مبتلا   ماندا و به کربلای پدر؟ نی به شام رفت

با عزو احتشام؟ نه با ذلت و عنا   تنها؟ نه، با زنان حرم، نام شان چه بود؟

زینب، سکینه، فاطمه کلثوم بی نوا   بر تن لباس داشت؟ بلی گر د ره گذار

بر سر عمامه داشت؟ بلی چوب اشقیا   از زینت زنان چه بجا مانده بُد؟ دو چیز

طوق ستم به گردن و خلخال غم به پا　　قاآنی است قایل این شعرها ؟ بلی
خواهد چه ؟ رحمت ، از که ؟ ز حق ، کی ؟ صف جزا

یغما جندقی:

قاآنی کا ہم عصر میرزا ابوالحسن یغما جندقی ہزل گوئی کے لئے مشہور ہے۔اس کا کلیات بڑے سائز کے تقریباً چار سو صفحات پر تہران میں ۱۲۸۳ھ میں چھپا۔اس کا سنجیدہ کلام مقدار میں ہزلیات سے بہت کم ہے، بیس صفحوں میں مرثیے ہیں۔اس کا سنجیدہ کلام اور مرثیے بتاتے ہیں کہ وہ اچھا شاعر ہے۔اس کو فارسی زبان پر قاآنی سے بھی زیادہ قدرت حاصل ہے۔لیکن اس کے کلام میں ویسا ترنم نہیں ہے جیسا قاآنی کے یہاں ہے۔اس کے مراثی کا موضوع شہادت امام حسینؑ ہے اور اس کے نوحہ جات سینہ زنی غالباً بے مثل ہیں، چند نوحوں کے ابتدائی اشعار درج کئے جاتے ہیں:

شکوه از چرخ ستم گرچه کنم گر نکنم　　چه کنم گر نکنم
گله از گردش اخترچه کنم گر نکنم　　چه کنم گر نکنم
غم عباسؑ بلا کش چه کشم گر نکشم　　چه کنم گر نکنم
ناله بر حسرت اکبرؑ چه کنم گر نکنم　　چه کنم گر نکنم

☆☆☆☆☆

کوه و صحرا خصم و شاه کم سپه تنها دریغ　　وا دریغ　　نصرت اعدا دریغ
قلب ایمان را شکست و نصرت اعدا دریغ　　وا دریغ　　نصرت اعدا دریغ
آه کز بی دولتان دین به دنیا باخته　　تاخته　　گشت کارش ساخته
بادشاه کشور دین خسرو دنیا دریغ　　وا دریغ　　نصرت اعدا دریغ

☆☆☆☆☆

هفتهٔ کین مه سر سال دغل قرن دغا ست　خون هلر مال هبا ست
شب غم روز ستم شام الم صبح عزاست　خون هلر مال هبا ست

زادۂ زهـرا بـکـام زادۂ مـروان نـگـر   آه آه   گـردش دوران نـگر

این بخواری آن بعزت این ببین و آن نگر   آه آه   گـردش دوران نـگر

آل مـروان تیغ بـر کف آل یسین نقد جان   زین و آن   گر نظر داری عیان

نـفی حق اثبات باطل کفر بین ایمان نگر   آه آه   گـردش دوران نـگر

ایک نوحے کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جو بہت سادہ اور عوامی زبان میں ہیں:

دلـم از زنـدگـانـی سـخـت سیره   بـمیـرم هـر چـه او تـر باز و یـره

زنـان را دل سـرائـے درد و مـاتـم   تـن مـردان نشـان تیغ و تیـره

پسر در خـون تپـان دختر عزادار   بـرادر کشتـه و خـواهـر اسیـره

خـروش تشنـه کـامـان زیر و بالا   ز خـاك تیـره تـا چـرخ اثیـره

کلیات یغؔما راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم سے ماخوذ ہے۔

جوہرؔی مروی:

میرزا محمد ابراہیم جوہرؔی نے مجلسوں میں پڑھنے کے لئے کتاب ''طوفان البکا'' تصنیف کی۔ اس کے اختتام کی تاریخ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۵۰ھ ہے۔ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہے مگر اس میں مصنف کی کہی ہوئی نظمیں کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کو مرثیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ ان نظموں میں کچھ مثنوی کی شکل کی ہیں اور کچھ قصیدے کی شکل کی۔ اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے ایک ترکیب بند چہاردہ بند ہے، جس کا ہر بند نو یا دس بیتوں کا ہے۔

مصنف نے اپنے والد کا نام محمد باقر المروی، بتایا ہے اور لکھا ہے کہ نیرنگ زمانہ کے باعث مجھ کو وطن چھوڑنا پڑا اور میں مختلف شہروں کی سیاحت کرتا ہوا دار السلطنت قزوین پہنچا، وہاں شاہی دربار میں منصب افصح الشعرا پر سرفراز اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوا۔ کچھ دن قصیدہ گوئی اور غزل سرائی کے

شغل میں مصروف رہا۔ ایک رات کو خیال آیا کہ یہ ژاژ خائی اور ہرزہ درائی کب تک۔ اگر ساری عمر اشعار فاسد و باطل میں صرف کردی تو موقف حساب میں کس منہ سے جاؤں گا۔ اس اثنا میں دو ذی علم حضرات حاجی ملا صالح اور آقا صالح خانیاں سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش سے ائمہ دین کے مصائب میں یہ کتاب لکھنا شروع کی اور بعد اختتام طوفان البکا اس کا نام رکھا۔

قطعۂ قطع تاریخ از مصنف کتاب:

این سفینه گشت طوفان البکا نامش که خود — در نجات عاصیان با کشتی نوح آشنا ست
خواستم تاریخ طوفان البکا از جوهریؔ — گفت طوفان البکا ابیات طوفان البکا ست

میں نے اس کتاب کا جو نسخہ دیکھا ہے وہ طہران میں ناصر الدین شاہ قاجار کے عہد میں چھپا تھا۔ پوری کتاب میں فلسکیپ سے بڑے سائیز کے ۲۳۶ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں ۳۷ سطریں ہیں۔ نظموں کے فی سطر چار مصرعے ہیں۔

بند اول از چہاردہ بند جوہریؔ:

ریزد ز چشم نهر سرشك الم چرا — خیزد ز ابر موج بلا دم به دم چرا
یا این که ره نیافته غم در حریم قدس — انبوه غم در آن حرم محترم چرا
یا قدسیان بحلقهٔ ماتم نشسته اند — خیل رسل بروضهٔ خیر الامم چرا
خیر البشر که باعث ایجاد عالم است — بر آل او ستیزه چه بود و ستم چرا
بر آل آدم این ستم از آل آدم است — گردون بظلم و جور چنین متهم چرا
از تیشهٔ ستیزهٔ عدوان به کربلا — سرو روان گلشن دین شد قلم چرا
گر این عمل بحکم ازل شد چگونه شد — گر این ستم به سهو قلم رفته هم چرا
صید کمند قهر الهی شوی یزید — صیادِ کبوترِ بامِ حرم چرا
آه و فغان وا اسفا در عرب ز چیست — جوش و خروش واعجبا در عجم چرا

گوید نبی حسینؑ و حسینؑ این حسینؑ کیست؟

چون خداوند از دو حرف کن صلائی آفرید | از صلائی در خدا قدرت بنائی آفرید
چون بلا را از برای امتحان ایجاد کرد | انبیائی خلق کرد و اولیائی آفرید
انبیا هر یك بد ردی مبتلا گشتند لیك | ذات بیچون بهر هر دردی دوائی آفرید
گلشنی در قصر آتش بهر ابراهیم ساخت | اژدهائی بهر موسی از عصائی آفرید
تنك دل یونس اگر در بطن ماهی شد مقیم | بطن ماهی را مقام دلکشائی آفرید
گرز هفتم خانه یوسف را بزندان جای داد | هم بزندان به ز هفتم خانه جائی آفرید
در گمان هر یك باندك دردی از پیغمبران | کایزد اینك طرفه درد بی دوای آفرید
تاز درد بی دوا آگاه گردند انبیا | کوفهٔ ایجاد کرد و کربلای آفرید
تا شود بر خلق ظاهر رفعت شان حسینؑ | شمر بی شرم و یزید بی حیائی آفرید
در عزای شاه دین گردید خود صاحب عزا | آن که اندر هر عزا صاحب عزای آفرید

جوهری را خواند مداح شهید کربلا
خلعت شاهی بر اندام گدائی آفرید

چو بیرق از کف عباسؑ نوجوان افتاد | شرر بخرمن سلطان انس و جان افتاد
بخون دیدهٔ انجم تپیده رایت مهر | که نعش صاحب رایت بخون تپان افتاد
دلاوری نه چو فرزند بوتراب دلیر | برادری نه چو عباسؑ نوجوان افتاد
گل حیات شد از قحط آب پژمرده | بهار عمر در اندیشهٔ خزان افتاد
بحال راکب خود مرکبش در آن وادی | ز ابر دیده گهربار و درفشان افتاد
نه اشك سرخ سمندش بخاك هامون ریخت | ستاره خون شده از چشم آسمان افتاد

زد آتشی بجهان جوهریؔ که شعلهٔ او
بکاخ عیش جهان و جهانیان افتاد

از نفاق فلك و گردش اختر زینب | هدف تیر بلا گشته مکرر زینب

دم آب خوشی از دھر ننوشید که سوخت | سوخت از آتش حرمان پیمبر زینب
ماتم جدّ کبارش بمیان بود که گشت | داغدار از الم فرقت مادر زینب
داغ محرومی زهرا بدلش بود هنوز | که رخ شیر خدا دید ز خون تر زینب
داشت خون جگر از قتل پدر کاندر طشت | دید لخت جگر پاك برادر زینب
بس نبود اینهمه جورو ستم ای چرخ که باز | رسد از کرب و بلا کرب و بلا بر زینب
چاك زد پیرهن صبر بتن چون پوشید | کفن اندر بر عباس دلاور زینب
چون حنا دید ز خون بر کف قاسم می گفت | چکند عمّهٔ بیچارهٔ مضطر زینب
دو پسر داشت دو نو رسته خط و مشکین | هر دو را دید در آن بادیه بی سر زینب
با پریشانی احوال دلش بود اسیر | به خم زلف رسای علی اکبر زینب
نظر اندر رخ ماه علی اکبر می کرد | داشت چون شوق ملاقات پیمبر زینب
دید چون عازم میدان شده اکبر می گفت | سوخت از این ستم ای چرخ ستم گر زینب
گاه می کرد شکایت بسوی قبر رسول | گاه می کرد فغان بر درد اور زینب
کای خدا گربه اسیری رود از کوفه بشام | دستگیر ستم لشکر کافر زینب
گر غریبانه به ویرانه نهد سر برخشت | گر بتاراج رود چادر و معجر زینب
به از انست که بیند بدن اکبر را | پاره پاره بدم نیزه و خنجر زینب

جوهریؔ جائزهٔ نظم تو این بس که به حشر
عذر خواهم شود از خالق اکبر زینب

مندرجہ بالا نظم میں سے کوئی شعر کم نہیں کیا گیا ہے۔

کربلا سے شام جاتے وقت حضرت زینبؑ امام حسینؑ سے کہتی ہیں:

شهدا قسمت تو خیل اسیران از من | کربلا منزل تو دشت و بیابان از من
رسد او کافور و کفن بهر شهیدان از تو | ناله و زاری این خیل یتیمان از من

نوجوان اکبر صد پارہ بی بسر از تو	ام لیلاے جگر خون پریشان از من
صف شکن حضرت عباسؑ دلاور از تو	ام کلثوم گرفتار لعینان از من
طفل شیرین سخنم اصغرؑ بی شیر از تو	شهر بانوی پسر مردهٔ نالان از من
تازه داماد بخون بسته نگارم از تو	مادر قاسمؑ دل خستهٔ گریان از من
تن هفتاد و دو تن بی کفن و غسل از تو	جمع عریان شدهٔ بی سرو سامان از من
بر سر نیزهٔ کین خواندن قرآن از تو	کعب نی خوردن از اعدائی لئیمان از من(۱)

جوہری کی متعدد نظمیں مکالموں کی صورت میں ہیں، ان کی ہر بیت کے پہلے مصرعے میں سوال اور دوسرے مصرعے میں جواب ہے۔

جب حضرت علی اکبر زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے ہیں اور امام حسینؑ ان کی آواز استغاثہ سن کر ان کے پاس پہنچتے ہیں تو دونوں میں یوں گفتگو ہوتی ہے:

بگفت ای اکبر من چیست حالت	بگفت از قتل من بشکست بالت
بگفت ای طفل قربان وفایت	بگفتا جان صد چون من فدایت
بگفتا خواهشی داری زبابت	بگفتا جان سپردن در رکابت
بگفت این زخم بی حد چیست برتن	بگفتا تیر باران شد ز دشمن
بگفتا چیست زخم کاری تو	بگفتا غصهٔ بی یاری تو
بگفتا قوت از جسم تو چون رفت	بگفت از جوشنم صد جوی خون رفت
بگفتا حیف از این نوجوانی	بگفتا حیف بی تو زندگانی

وقار شیرازی:

وقار شیرازی کا نام مرزا احمد تھا۔ وہ وصال کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مختلف علوم کا عالم تھا۔ خط نسخ

---

(۱) حزن المومنین، ص ۳۵۲، ۳۵۳۔

میں اپنے باپ کے بعد بڑا نام پیدا کیا۔ ۱۲۶۶ھ میں اپنے چھوٹے بھائی میرزا محمود طیب متخلص بہ حکیم کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا اور ایک سال بمبئی میں رہا، وہاں مثنوی مولوی روم لکھی جو چھپی اور نہایت مشہور ہوئی۔ اس کے بعد نواب نصر الدولہ فیروز میرزا حکمران فارس کی طلبی پر اپنی وطن واپس گیا۔ ۱۲۷۴ھ میں ناصر الدین شاہ قاجار کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا، بادشاہ عنایت سے پیش آیا اور وقارؔ خلعت و مرسوم سے کے ساتھ وطن واپس گیا۔ نظم ونثر عربی و فارسی میں بلند مرتبہ رکھتا تھا، مجمع الفصحا کا مؤلف ۱۲۷۴ھ میں وقارؔ سے تہران میں ملا، اُس وقت اس کی عمر ۴۲ سال کی تھی، اپنے والد وصالؔ شیرازی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

خد یو ملك هنر صاحب فرشته سیر   جمال مملکت فارس قدوة الادبا

وصالؔ مالك ملك و سخن كه روح القدس   کند معاونتش گاه فکرت و نشا

ایا ستوده خصالی که راه می نبرد   به منتهای کمال تو فکرت دانا

تو رهنمائی و نا قوس بشکند راهب   تو وعظ خوانی و زنّار بگشا ترسا

وقارؔ نزد تو نام ادب برد هیهات   وقارؔ پیش تو عرض هنر دهد حاشا(۱)

وقارؔ کے مرثیوں کا کوئی مجموعہ علحدہ چھپا ہوا راقم کی نظر سے نہیں گزرا، لیکن کتاب ریاض الشہادۃ جلد سوم کے صفحہ ۳۲۱ سے صفحہ ۳۳۸ تک حاشیے پر وقارؔ کے مرثیے درج ہیں۔ اور اس کتاب کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں، مراثی وصالؔ مطبوعہ ایران میں بھی وقار کے چند مرثیے شامل ہیں۔ وقار، نے بھی محتشم کاشی کے مرثیہ دوازدہ بند کا جواب کہا ہے۔

خاکیؔ شیرازی:

میرزا محمد ابراہیم خاکیؔ شیرازی کے مرثیوں کا مجموعہ اس کے انتقال کے بعد ۱۳۰۶ھ میں بمبئی میں چھپا۔ خاکی کے کلام سے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر اکہتر سال کی ہو چکی تھی۔

---

(۱) مجمع الفصحا، جلد دوم، ص ۵۴۸، ۵۵۱۔

دریغ از عمر هفتاد و یك خاكیِ زیبا كی الهی کن به هفتاد و دو تن در حشر محشورش

خاکی کے مطبوعہ مجموعۂ مراثی میں پہلا مرثیہ سترہ بند کا ترکیب بند ہے۔ اس کی بحر، کئی بندوں کے قافیہ وردیف اور بعض مضامین کی یکسانی بتاتی ہے کہ یہ مرثیہ دوازدہ بند محتشم کے جواب میں کہا گیا ہے۔ دو مرثیے واقعات مقبل کے طرز کے ہیں۔ متعدد مرثیوں میں کسی کی گفتگو یا مکالمہ نظم کیا گیا ہے۔ خاکی کے مرثیوں میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی۔ اس نے ایک مرثیہ وصال شیرازی کی تقلید میں ایسا کہا ہے۔ جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ''شنیده اید'' سے اور دوسرے شعر کے دونوں مصرعے ''ندیده اید'' سے شروع ہوتے ہیں اور باقی شعروں کا پہلا مصرع ''شنیده اید'' سے اور دوسرا مصرع ''ندیده اید'' سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مرثیہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

شنیده اید حسینی به ظلم گشت شهید شنیده اید که چشم سپهر خون بارید
ندیده اید که دارد فلك لباس سیاه ندیده اید که انجم ز گریه دیده سپید
شنیده اید که از ناکسان بر اوچه گذشت ندیده اید که بر بیکسان او چه رسید
شنیده اید که کردند تیر بارانش ندیده اید به یاران و عترتش چه رسید
شنیده اید که از خون سر نمود وضو ندیده اید که چون در سجود سر بخشید
شنیده اید سری رفت بر سنان سنان ندیده اید که خنجر به خنجرش که کشید
شنیده اید تنی گشت پایمال ستور ندیده اید چو ماهی به بحر خون غلطید
شنیده اید که شد یوسفی ز چاه بچاه ندیده اید عزیزی که شد ذلیل و عبید
شنیده ایدز خون شد حنای دامادی ندیده ایدعروسی که نعش شوهر دید
شنیده اید که کرد العطش سلیمانی ندیده اید که خاتم ز قحط آب مکید
شنیده اید که شد ناوکی ز شست قضا ندیده اید قدر حلق نازك که درید
شنیده اید که شد کودکی ز عمه جدا ندیده اید به دامان عم چو گشت شهید
شنیده ایدکرا تخت و تاج شد تاراج ندیده اید ز گوش که گوشواره کشید

شنیده اید که آویخت بر درخت سری ندیده اید کلام حق از شجر که شنید

شنیده اید که جان داد در خرابهٔ شام ندیده اید کرا سر ز تن به طشت برید

شنیده اید که دندان مصطفی بشکست ندیده اید که زد چوب بر لب که یزید

بصبح و شام و شب و روز می کند خاکی پس از سلام حسین لعن بر یزید پلید

حزن المومنین ص ۲۸۸۔۲۸۹ میں بھی یہ مرثیہ موجود ہے مگر اس کا مقطع اور یہ تین شعر اس میں نہیں ہیں اور ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں، اور تین شعر ایسے موجود ہیں جو خاکی کے مطبوعہ مجموعۂ مراثی میں نہیں ہیں:

شنیده اید که کردند تیر بارانش ندیده اید به یاران و عترتش چه رسید

شنیده اید که از خون سر نمود وضو ندیده اید که چون در سجود سر بخشید

شنیده اید که آویخت بر درخت سری ندیده اید کلام حق از شجر که شنید

جودی خراسانی:

میرزا عبدالجواد جودی خراسانی مشہور اور مقبول مرثیہ گویوں میں تھے۔ ان کے کلیات کے تین مطبوعہ نسخے میرے کتب خانے میں ہیں۔ ایک نسخہ ناصر الدین شاہ قاجار کے عہد میں رجب ۱۲۹۹ھ میں چھپا، دوسرا مطبع مظفری، بمبئی میں چھپا، جس کے سرورق پر غرہ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ اور آخری صفحے پر رجب ۱۳۲۵ھ درج ہے اور تیسرا مطبع علمی میں محرم ۱۳۵۱ھ میں چھپا، ان تینوں نسخوں میں نظموں کی ترتیب بالکل یکساں نہیں ہے، ممکن ہے کہ ان کی تعداد بھی یکساں نہ ہو۔ پہلا نسخہ کلیات جودی کی اولین اشاعت ہے۔ اس کے دیباچے کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"سالهاست که اشعارِ مصائب ائمه اطهار ...از ...افصح الشعرا میرزا عبد الجواد المتخلص به جودی المشهدی الخراسانی ...بسان حال ناظمش...پریشان و به هر طرف پراگنده بود ...لهذا این بندهٔ عاصی ...محمد شفیع قزوینی ...خواست

که ... مجموعه مهیا شود تا دست طالبان به سهولت بدان رسد''.

اسی دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات جودیؔ پہلی مرتبہ ناصر الدین شاہ قاجار کے عہد میں چھپا تھا۔ کلیات میں خاتمے کے قریب ایک ترکیب بند مرثیہ ہے، جس کا نام تینوں نسخوں میں چہاردہ بند، ہے، لیکن دوسری اشاعت میں اس کے صرف تیرہ بند درج کئے گئے ہیں۔ حقیقت میں دوازدہ بند محتشم کی تقلید میں اس مرثیے میں بھی بارہ ہی بند ہیں، تیرہویں بند میں بادشاہ وقت کے لئے چہاردہ معصومین کے واسطے سے یہ دعا کی گئی ہے:

پائنده دار خسرو انجم سپاه را ‏ ‏ ‏ سلطان عصر ناصر دین پادشاه را (۱)

چودہویں بند میں مرتب کلیات میرزا محمد شفیع کی دعا دی گئی ہے، اس بند کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

بانی این کتاب که دادارش یار باد ‏ ‏ ‏ تا نامی از جهان بجهان بر قرار باد

کو کرده جمع نسخه اول برای چاپ ‏ ‏ ‏ نیکو بود که نام ز کس یادگار باد

دارای علم و فضل و هنر میرزا شفیع ‏ ‏ ‏ کورا شفیع روز جزا غم گسار باد (کذا)

از بهر این کتاب چه زحمت کشیده اند ‏ ‏ ‏ در چاپ اولش که پایدار باد

هر کس بقیه را بکند چاپ ازین کتاب ‏ ‏ ‏ او را نبی معین و خداوند یار باد

تاریخ ختم ماه رجب دان کتاب را ‏ ‏ ‏ سال هزار و سیصد و یك کم شمار باد (۲)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات جودیؔ کو مرتب کر کے پہلی بار میرزا محمد شفیع نے چھپوایا لیکن یہ کلیات جودیؔ کے کل کلام پر مشتمل نہیں ہے۔ اس لئے وہ خواہش مند ہیں کہ بقیہ کلام کو بھی کوئی چھپوا دے۔

---

(۱) نسخہ ۳، میں اس شعر کی جگہ دوسرا شعر لکھ دیا گیا ہے جو غلط بھی ہے اور بے محل بھی۔

(۲) نسخہ ۲ میں چودھواں بند غیر متعلق ہونے کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔

کلیات جودی میں مرثیہ محتشم کے طرز کا ایک ترکیب بند ہے، پانچ چھ مختصر مسدس ہیں جن میں سب سے بڑا انیس بند کا ہے۔ ان کے علاوہ نظمیں کثیر تعداد میں ہیں جو بیشتر غزل کی شکل کی اور چند مثنوی کی شکل کی ہیں، بڑی تعداد ایسی نظموں کی ہے جن میں کسی کی کسی سے گفتگو نظم کی گئی ہے، ان نظموں کے عنوان مکالمہ، گفتگو، خطاب، زبان حال کے لفظوں سے شروع ہوتے ہیں مثلاً مکالمہ امام علیہ السلام با زینب خاتون، گفتگوئے نصرانی با امام علیہ السلام، خطاب زینب خاتون با شمر ملعون، زبان حال سید سجاد با جسد مطہر امام، ان مرثیوں میں بالعموم ایک شخص کی گفتگو ہوتی ہے، دوسرے کا جواب نہیں ہوتا، مگر کہیں کہیں جواب بھی مل جاتا ہے مثلاً:

اذن میدان طلبیدن سید سجاد علیہ السلام:

الا ای شهسوار دین امام مکه و بطحا　　کنون چون ماندهٔ بیکس میان کوفیان تنها
مرا یك مطلبی باشد اگر منت نهی بر من　　شوم فارغ ز رنج و محنت و خواری این دنیا
روا نبود که اکبر کشته و عباس عمویم　　دو دستش قطع و برهم خورده باشد جملهٔ اعضا
روا نبود که قاسم در رکابت جان فدا سازد　　بجا ماند پدر جان عابدینت یکه و تنها
بده اذنم که چون ایشان فدا سازم براهت جان　　که مشتاقم پدر جان جان کنم قربان درین ماوی

جواب دادن امام فرزند بیمار خود را:

ای که بر نخل امامت تو پس از من ثمری　　نیست در بحر ولایت چو تو یکتا گهری
بگذر از رفتن میدان تو ایا در یتیم　　که پس از من به یتیمان تو بجای پدری
داغ مرگ علی اکبر کمرم را بشکست　　طاقتم نیست دگر ماتم چون تو پسری
راز خود گو به من امروز که فردا این قوم　　نگزارند نمائی تو به کویم گذری
نه همین غم بتو یاراست چهل منزل راه　　تا چهل سال دگر تیر بلا را سپری
به تماشای تو و زینب و کلثوم و رباب　　مردم کوفه در آیند به هر بام و دری
اندر آن روز که سازند ترا وارد شام　　سنگ بر فرق تو ریزند به هر ره گذری

خلق بنشسته سرِ کرسی زر نزد یزید　　تو بہ پاتا بتو کی اوفتد او را نظری

نہ همین یك دل جودی دل عالم خون است

ز این چنین گونه وداع پسری با پدری

ایک مرثیے میں ایک مردِ شامی اور حضرت سید سجادؑ کا مکالمہ یوں لکھا ہے کہ ہر شعر کے پہلے مصرعے میں شامی کا سوال اور دوسرے مصرعے میں حضرت کا جواب ہے۔ اس مرثیے میں چودہ شعر ہیں۔ چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:

بگفت اهل کجائی وطن ترا به کجاست　　بگفت زاهل حجاز و مدینه منزل ماست

بگفت دین که داری تو ای خجسته لقا　　بگفت یافته از ما رواج دین خدا

بگفت بهر چه افگندهٔ سر اندر زیر　　بگفت گردنم آزرده گشته از زنجیر

بگفت از چه به دندان گزی همی لب را　　بگفت می نگرم سر برهنه زینب را

بگفت کیست همیں دختر ستم دیده　　بگفت فاطمهٔ نو عروس غم دیده

بگفت کیستی و از که خود تر انسب است　　بگفت جدّ کبارم محمدؐ عرب است

بگفت کیست بگو بابت ای زجان نومید　　بگفت کشتهٔ تیغ جفا حسینؑ شهید

جودیؔ نے ان نظموں میں واقعہ کربلا سے متعلق مختلف موقعوں اور منظروں کو مکالموں اور گفتگوؤں کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔ مثلاً ذیل کی نظم میں یہ دکھایا ہے کہ شہیدوں کے سر دربار یزید میں لائے گئے ہیں اور یزید کے خادم اہل حرم سے طنزیہ گفتگو کرتے ہیں:

مژده زینب که شب هجر به پایان آمد　　بخرابه سر سالار شهیدان آمد

چشم بکشاد می ای عابدؑ بیمار زهم　　که ترا بهر عیادت شه خوبان آمد

اُم لیلی بطلب عطر و گلاب و شانه　　که علی اکبر تو زلف پریشان آمد

اُم کلثوم روان شوز پی استقبال　　سر عباس تو چون مهر درخشان آمد

نو عروسا به سر راه به تعجیل بیا　　که سویت قاسم داماد شتابان آمد

سینہ مخراش بناخن منما نالہ و آہ | کہ سرِ اصغرت آن نو گل خندان آمد
ای سکینہ بہ نثار سر باب آورجان | کہ ترا بھر نثار سر او جان آمد
ای رقیہ مکن افغان دگر از درد منال | باش خاموش کہ بردرد تو درمان آید

جودیؔ نے ایک نظم میں روز عاشورا کے اہم واقعات ایک نئے انداز سے بیان کئے ہیں۔ اس نظم کے ہر شعر کا پہلا مصرع ''نمی گویم'' اور دوسرا مصرع ''ہمی گویم'' کے لفظوں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نظم درج ذیل ہیں:

نمی گویم چها باشاه دین در زیر خنجر شد | همی گویم جدا راسش به ده ضربت ز پیکر شد
نمی گویم چسان تاراج شد از کین لباس او | همی گویم که روی خاك عریان جسم انور شد
نمی گویم چسان شد پیکرش نرم از سُم مرکب | همی گویم تن زارش نحاك تیره همسر شد
نمی گویم چسان کشتند سقّای یتیمان را | همی گویم جدا بازوی عباس دلاور شد
نمی گویم چسان شد روز بانوی حرم راشب | همی گویم که لیلیٰ خون جگر از مرکب اکبر شد
نمی گویم چسان زد دست و پا اندر دم مُردن | همی گویم نشان تیر حلق خشك اصغر شد
نمی گویم چسان کردند قاسم را بخون غلطان | همی گویم عروسش را خضاب از خون شوهر شد
نمی گویم چسان بر خیمه گاه شه زدند آتش | همی گویم که دامان سکینه پُر ز اخگر شد
نمی گویم چسان بُردند سوی شام اسیران را | همی گویم که پای کودکان مجروح یکسر شد
نمی گویم که در دوران چه آمد بر سر زینبؑ | همی گویم سیه بر سر ز مرگ شس برادر شد

نمی گویم درین ماتم چه آید بر سر جودیؔ
همی گویم که از خون جگر اوراق او تر شد

کلیات جودیؔ کے تین مطبوعہ نسخوں کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، جن میں جودیؔ کے مرثیے بھی شامل ہیں۔

ان کے علاوہ مختلف ایرانی شاعروں کی مدحیہ نظموں کا ایک مجموعہ ''جنگ المناقب والمصائب

"کے نام سے کارخانہ علی قلی خان قاجار میں ۱۳۰۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں ۲۳۹ صفحے ہیں اور کل صفحوں کے حاشیے پر جودی کے مرثیے درج کر دیئے گئے ہیں۔

ترکی شیرزی:

ترکی کے کلام کا ایک مجموعہ ۱۳۰۹ھ کا چھپا ہوا میرے کتب خانے میں ہے، افسوس ہے کہ اس نسخے کا پہلا ورق اور آخر کے چند ورق غائب ہیں۔ اس لئے نہ ترکی کا نام معلوم ہو سکا نہ ان کے مجموعۂ کلام کا۔ لیکن ایک مرثیے کے آخر میں ایک مصرع ہے "یا علی ترکیست هم نام حسین "۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کا نام یا نام کا خاص جز لفظ حسین تھا۔

اس نسخے کا حجم ۲۰۶ صفحے ہے اور ہر صفحے میں ۱۷ سطریں ہیں۔ ابتدا میں بزرگان دین کی مدح میں متعدد قصیدے، ایک مخمس، ایک ترجیع بند ہے۔ ان نظموں کے آخری حصے میں تقریباً ہمیشہ مصائب امام حسین بیان کئے گئے ہیں۔ ان نظموں کے بعد بہت سے مرثیے ہیں۔ یہ مرثیے زیادہ تر قصیدے کی شکل کے اور مختصر ہیں۔ ایک مرثیہ ۳۵ بند کا ترکیب بند ہے جس کا عنوان ہے دوازده بند در مرثیہ مشتمل است بر سی و پنج بند۔ بندوں میں شعروں کی تعداد کم سے کم ۸ اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ ہے۔ اس مرثیے پر محتشم کے مرثیے کا اثر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اس کا چوتھا بند ۱۵ شعروں کا ہے جس میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

سبط رسول شاه شهیدان کربلا　　بنهاد چون قدم به بیابان کربلا

با آنکه بود آب جهان مهر مادرش　　لب تشنه جان سپرد به میدان کربلا

از کشتهای غرقه بخون ز آل بوترابؑ　　گردید لاله زار گلستان کربلا

از تند باد حادثهٔ روزگار دون　　خاموش گشت شمع شبستان کربلا

دود از زمین به ذروهٔ عرش برین رسید　　از آه آتشین یتیمان کربلا

سیل سر شك دیدهٔ ترکی بعید نیست　　گر بگذرد ز قبهٔ ایوان کربلا

فارسی میں مسدس مرثیے کہنے کا بالکل دستور نہ تھا، مگر ترکی کا ایک مرثیہ مسدس ہے۔ اس کا پہلا اور آخری بند نقل کیا جاتا ہے:

دید شاہ شہدا چون جسد اکبر را　　لعل سان دید ز خون آن تن چون گوہر را

در بغل تنگ کشید آن بدن اطہر را　　بوسہ از مہر زد آن کا کل چون عنبر را

گفت ای تازہ جوان نور دو چشم ترمن

ای بہ خون غرقہ علی اکبر مہ پیکر من



حیف زود از برم ای سرو روان رفتی تو　　کام نادیدہ ازین دار جہان رفتی تو

من شدم پیرو دریغا کہ جوان رفتی تو　　چشم بستی ز جہان سوی جنان رفتی تو

نہ ہمیں ترکیؔ مدّاح ازین غم سوزد

کین شراریست کہ خشک و تر عالم سوزد

اس مسدس مرثیے میں کل آٹھ بند ہیں۔

متعدد مرثیے حضرت زینبؑ، سکینہؑ، فاطمہ صغراؑ، یا کسی اور کی زبان حال سے کہے گئے ہیں، یہ بھی قصیدے کی شکل کے ہیں۔

مرثیوں کے آخر میں ایک دعائیہ نظم ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایران ما کہ ہست در آن پاک سر زمین　　یعنی زمردمان خدا ترس پاک دین

ملکش ز چشم زخم عدو باد در امان　　الطاف تو اہالی اور انگاہ بان

لاسیما کہ خسرو جمشید دستگاہ　　گیہان خدای ناصر دین شاہ پادشاہ

شیرازیان کہ مردم دانا و عاقل اند　　در زیر ظل رافت این شاہ عادل اند

نام حسینؑ چو می گذرد بر زبان شان　　خون جای اشک می رود از دیدگان شان

ہر سال و ماہ و ہفتہ و روز و شب از وفا　　دارند بزم تعزیۂ شاہ دین ہدا

در هر کجا که بزم عزائی بپا کنند
بعد از فراغ تعزیه شه را دعا کنند

یا رب که عمرِ ناصرِ دین شه زیاد باد
نو شیروان صفت صفتش عدل و دادباد

ترکیؔ بود به مردم شیراز خاك راه
مدّاح اهل بیت و دعا گوی پادشاه

منقولہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی ناصر الدین شاہ قاجار کے عہد میں تھے۔ ان کا مسکن شیراز میں تھا اور وہاں مجالس عزا بہت کثرت سے منعقد ہوتے تھے۔

اس دعائیہ نظم کے بعد مختلف مضمونوں کی بہت سی رباعیاں ہیں۔ ان کی ترتیب ردیف وار ہے جو دیوان میں غزلوں کی ہوتی ہے اور ان کے مجموعے کا نام ''دیوان رباعیات ترکی شیرازی'' قرار دیا گیا ہے۔

ترکی کا کلام زبان وخیالات دونوں کے اعتبار سے بہت سادہ ہے۔ اس میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی، مگر وہ مرثیوں کی بحریں اکثر مترنم اور رواں اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کے چند مرثیوں کے تین تین شعر نقل کئے جاتے ہیں:

با زغم از چار سو ریخت بجانم شرار
در نظرم گشت روز تیره تر از شام تار

یاد چو آید مرا واقعهٔ کربلا
دل شودم غرق خون دیده شود اشکبار

نیست عجب گر چکدخون دل از دیده ام
بسکه ز غم روز و شب گریه کنم زار زار



شکوه هائی دارم از تو آسمان ای آسمان
تابکی گردی بکام دشمنان ای آسمان

از جفایت عرصهٔ کرب و بلا چون لاله زار
گشت از اجساد پاك کشتگان ای آسمان

قامت سبط نبی را در زمین کربلا
درغم عباس کردی چو کمان ای آسمان



به نجف گذر کن ایا صبا تو ز کربلا زره وفا
به علیؑ بگو که شهید شد پسر عزیز تو از جفا

توشہ سریر فتوّتی دُر بحرِ جود و مروّتی　　ز نجف بیا تو بہ کربلا بہ حسینؑ خود نظری نما

شلہ نخل قامتِ او نگون رخ او ز خون شلہ لالہ گون　　او فتادہ بہ بحر خون سر او بہ ناوك نیزھا

☆☆☆☆☆

چو در کربلا خسرو نشأتین　　شھید ستم شاہ بیکس حسینؑ

ز جور فلك بیکس و یار شد　　در ان دشت بی یار و انصار شد

نماند اندران وادی پُر بلا　　ز پیر و جوان زندہ یك تن بجا

ترکی کا ایک ترجیع بند جناب امیرؑ کی مدح میں ہے جس کا شعر ترجیع حسب ذیل ہے:

چون دور زمانہ کرد پیرم　　خواھم بہ محبتت بمیرم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی نے اچھی عمر پائی تھی۔

ترکی کا ایک دوسرا مجموعہ کلام "مفتاح البکا" کے نام سے میرے کتب خانے میں ہے جو مظفر الدین شاہ قاجار کے عہد میں رمضان ۱۳۱۸ھ میں مطبع گلزار حسنی بمبئی میں چھپا تھا، یہ اصل میں ترکی کے مخمسات کا مجموعہ ہے۔ اس کے آخر میں مصنف نے اس کا سبب تالیف وتصنیف، یہ بتایا ہے کہ بعض ذاکروں نے مجھ سے خواہش کی کہ محتشم کاشانی، وصال شیرازی اور جودی خراسانی کے مرثیے جو ذاکر پڑھا کرتے ہیں ان کو مخمس کر دیا جائے، اس لئے میں نے چند مرثیوں کو مخمس کرنے کی جسارت کی۔ اسی سلسلے میں لکھتا ہے:

روز دوم ربیع ثانی　　مشغول شدم بہ ابتدایش

تا آخر ماہ من رساندم　　با عون خدا بہ انتھایش

این نسخہ رسید چون بہ اتمام　　"مفتاح بکا" نھادمش نام

اس کتاب کو میرزا محمد امین التجا شیرازی نے بنظر ثواب چھپوا کر خواہش مندوں میں مفت تقسیم کر دیا۔

''مفتاح البکا'' میں مخمسوں کے بعد ترحی کی طبع زاد نظمیں ہیں یعنی ایک قصیدۂ ایک پیش واقعہ، ۱۳ نوحے اور ۲۱ رباعیاں۔

یغما جندقی کے نوحۂ سینہ زنی اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، ترحی کے نوحے بھی اسی انداز کے ہیں، دو نوحوں کے چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

شورش محشر بپا اندر جهان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

گلشن آل پیمبر را خزان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

☆☆☆☆☆

کین پنهانی که با آل پیمبر داشتی — آنچه در سر داشتی

عاقبت آن کین پنهان را عیان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

خواندی از یثرب به مهمانی حسینؑ را در عراق — از ره مکر و نفاق

آب را اول دریغ از میهمان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

پیکرش عریان فگندی در میان آفتاب — در کتاب نهر آب

آفتابی را بخاك و خون تپان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

شق نمودی فرق اکبر ر از تیغ کوفیان — از جفایت الامان

قصهٔ شقّ القمر از نوعیان کردی فلك — سرنگون گردی فلك

☆☆☆☆☆

ای فلك تاکی روا داری بر آل بوتراب — ظلم بی حدو حساب

خانهٔ دین را نمودی ای فلك از کین خراب — خانهٔ ظلمت خراب

☆☆☆☆☆

پور بوسفیان بصد عجب و تکبر بر سریر آن شریر — خفته بر فرش حریر

بر تراب افتاده تن صد پاره پور بو ترابؑ — خانهٔ ظلمت خراب

☆☆☆☆☆

عابدؑ بیمار را بردی ز کوفه سوی شام چون غلام　　در میان خاص و عام
غل بگردن پای در رنجیر و بر باز و طناب　　خانهٔ ظلمت خراب

☆☆☆☆☆

عصمت صغرا شد از بیدادت ای گردون پیردستگیر　　در کف شمر شریر
دیده گریان سینه بریان دل کباب از قحط آب　　خانهٔ ظلمت خراب

اوپر ترکی کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے، جس میں اس نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اس کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے، جس میں وہ اپنی عمر ساٹھ سے متجاوز بتاتا ہے:

بگزشت ز شصت سال عمرم به جهان　　آن هم شده صرف روز و شب در عصیان
این باقی عمر هر چه باشد یا رب　　لطفی کن و عاقبت بخیرم گردان

بعض رباعیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی ہندوستان میں مقیم تھا، مگر دوسرے ایرانی شاعروں کی طرح وہ بھی یہاں کے قیام سے مطمئن نہ تھا۔

در کشور هند چند ماتم بی کس　　تا چند ز دل فغان کشم همچو جرس
غیر از تو چو فریاد رسی نیست مرا　　یا شاه خراسان تو به فریادم رس

☆☆☆☆☆

در محبس هند چند باشم محبوس　　تا چند خورم صدمهٔ هندو و مجوس
لطفی کن و آزاد کن از راه کرم　　زین محبسم ای باد شهه کشور طوس

☆☆☆☆☆

یا رب من دل خستهٔ بی خویش و تبار　　در کشور هند مانده ام بی کس و یار
باشد به دلم آرزوی کرب و بلا　　یا رب به دلم آرزویش را مگذار

خرم شیرازی:

میرزا ابوالحسن خرم شیراز کے ایک ذی علم شخص تھے۔ اپنے عزیزوں بالخصوص اپنے چچا کی

بدسلوکیوں اور حق تلفی سے تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ وہ ۱۳۰۷ھ میں نجف اشرف کے ارادے سے وطن سے نکلے مگر بعض اتفاقات نے ان کو ہندوستان پہنچا دیا۔ یہاں ایران کے قونسول جنرل حاجی میرزا حسین خان انصاری سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے ایک دن خرم سے کہا کہ حضرت علیؑ کی شجاعت کے بیان میں ''حملۂ حیدری'' کی سی منظوم کتاب لکھی گئی، مگر امام حسینؑ کی شجاعت کے بیان میں کوئی منظوم کتاب نہیں لکھی گئی، چنانچہ ان کی فرمائش سے خرّم نے واقعات کربلا ایک مثنوی کی شکل میں نظم کئے اور اس کا نام ''شجاعت الحسینی'' رکھا۔ اس مثنوی میں تین ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔

مثنوی شجاعت الحسینی پہلی مرتبہ ۱۳۰۹ھ میں میرزا حسین خان کی فرمائش سے چھاپی گئی تھی۔ ۱۳۲۶ھ میں مفتاح السلطنۃ میرزا داود خان ایران کے قونسول جنرل ہو کر ہندوستان آئے۔ خرّم ان کی خدمت میں مشرف ہوئے، اثنائے گفتگو میں اس مثنوی کا ذکر آیا اور معلوم ہوا کہ اب وہ کمیاب ہے۔ اس پر انہوں نے اس کے چھاپنے کا حکم دیا، یہ دوسرا ایڈیشن مطبع مظفری بمبئی میں ۱۳۲۸ھ میں چھپا، اس مرتبہ اس مثنوی کے ساتھ خرّم کا اور کلام بھی شامل کر کے کتاب چار جلدوں میں تقسیم کی گئی، پہلی جلد میں مثنوی شجاعت الحسینی ہے۔ دوسری جلد میں ایک مثنوی تقریباً سات سو شعروں کی ہے۔ اس کا نام ''مولود نامہ حضرت حجت'' ہے۔ تیسری جلد میں مدح ائمہ میں قصیدے اور پانچ مرثیے اور چند مسمط ہیں اور اس کا نام ''مناقب الائمہ'' ہے۔ چوتھی جلد میں قصیدے اور غزلیں ہیں۔ اس جلد کا نام ''مطلع انوار'' ہے، یہ قصیدے ناصر الدین شاہ قاجار، مظفر الدین شاہ قاجار، احمد شاہ قاجار اور سلطنت ایران کے بعض عمائد کی مدح میں ہیں۔ دو تین قصیدے حضرت علیؑ کی مدح میں بھی ہیں۔ ان منظوم جلدوں کے بعد نثر میں ایک رسالہ ہے جس کا نام ہے ''بہار خرم و حدیقۂ دانش''، اس رسالے کا موضوع عروض و قافیہ اور فن بدیع ہے۔ اس میں ۴۰ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں ۲۲ سطریں ہیں۔

خرّم کا جو مختصر حال اوپر لکھا گیا ہے وہ اس کتاب کے دیباچے سے لیا گیا ہے۔ اسی دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خرّم ۱۳۲۴ھ میں عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، ایک دن

مشہور مجتہد آقائے صدر کے محضر میں بڑے بڑے علما و ادبا موجود تھے۔ اس بزم میں خرّم نے ایک قصیدہ امام موسیٰ کاظم کی مدح میں پڑھا۔ جس کو تمام حاضرین نے بہت پسند کیا اور آقائے صدر نے خرّم کو صدر الشعرا کا خطاب دیا۔

جلد سوم مسمّی بہ ''مناقب الائمہ'' میں جو پانچ مرثیے شامل ہیں ان میں چار قصیدے کی شکل کے ہیں اور ایک ترکیب بند ہے۔ جس میں بارہ بارہ شعروں کے دس بند ہیں۔ اس مرثیے کے ابتدائی اور آخری بند سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

شد باز مرا سینۂ مجروح پُر از غم آمد مگر ای ماتمیان ماہِ محرم

هر سو نگرم سر بسر از کهتر و مهتر بینم همه از بهر عزا گشته مصمم

آن یك به درو بام کشد پردهٔ نیلی و آن یك به تن خویش کند جامهٔ ماتم

در کون و مکان نیست عیان یك لب خندان از اهل جهان نیست کنون یك دل خرم

از دیده نه ریزد همه جز اشك پیاپی از سینه نه خیزد همه جز آه دمادم

گوئی که غباری ز عزا بر رخ امکان از عرش برین تا به زمین گشته مجسم

آیا چه مصیبت بود این ماتم عظمیٰ کایستان به عزا متفق اند آدم و خاتم

در عرش برین مسند این تعزیه فرش است

گوئی که عزا از جهت صاحب عرش است

زینب ز سفر باز چو سوی وطن آمد چون بلبل غمگین به خزان در چمن آمد

چون رفت سفر با گل و شمشاد و سمن رفت آمد به وطن بی گل و سروو سمن آمد

چون رفت سفر جان جهان همره تن داشت آمد به وطن گشته جدا جان ز تن آمد

چون رفت سفر اکبر و عباس جوان داشت برگشت چو بی اصغر شیرین سخن آمد

آمد به سوی روضهٔ ما در به فغان گفت دانی چه جفاها که ز اعدا به من آمد

ای مادر غم دیده نبودی که به بینی از کینه چه بر اکبر نازك بدن آمد

چون شرح غم خویش بیان کرد به مادر

از دیده بیفشاند گهر بر رخ انور

قصیدے کی شکل کا ایک پورا مرثیہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

تاکه از کرب و بلا نام و نشان خواهد بود کار ما روز و شبان آه و فغان خواهد بود

تاکه از شط فرات آب روان آید باز اشکم از دیده چو سیلاب روان خواهد بود

جان بقربانی آن خاك باید کردن که شفای دل بیمار از آن خواهد بود

هر که امروز کند گریه به فرزند رسولؐ جایگاهش همه فردا بجنان خواهد بود

شاهِ لب تشنه به یاران شبِ عاشورا گفت که بفردا همه را خشك دهان خواهد بود

دوستانم همه را غوطه بخون باید خورد یاورانم همه بر خاك طپان خواهد بود

زخمم از دوری اصغر به جگر خواهد خورد قدم از فرقت اکبر چو کمان خواهد بود

مرگ عباس شکستم به کمر خواهد داد داغ قاسم به جگر رخنه کنان خواهد بود

هر که در راه خداوند رضا شد به قضا سرِاو جلوه گر نوك سنان خواهد بود

پیش رویم چو نمایند شهید عبد الله دیده بر حالت زارش نگران خواهد بود

اصغرم را چو گلو پاره کنند از دم تیر قد چرخ از غم آن تیر کمان خواهد بود

شرح این واقعه جان ز آتش غم خواهد سوخت درد این حادثه بر جان جهان خواهد بود

خرما نام تو خرم بود و خوردن غم

همه کار تو همین است و همان خواهد بود

اسی تیسری جلد میں ایک مخمس ہے جس کے چند بندوں میں ''مجلس مشروطہ ایران'' کے افتتاح پر مسرت و تشکر کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بند یہ ہے:

سالها دل به آرزو می خواست تا شود کارها به قانون راست

بخت از خواب بی کران برخاست شخص مشروطه خویشتن آراست

آنچه دل خواست از خدا آن شد

معتقد بوشہری:

میرزا حسین معتقد کے مناقب و مراثی کا مجموعہ ان کی زندگی میں ''جواہر الزواہر'' کے نام سے بمبئی میں ۱۳۰۹ھ میں چھپا۔ اس کے آخر میں محمد علی نہائی نے مصنف کا کچھ حال لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرزا حسین کا اصلی وطن رے شہر ہے، لیکن وہ اہرم میں پیدا ہوے اور بوشہر میں سکونت اختیار کی۔ ان کی ولادت ۱۲۵۳ھ میں ہوئی، وہ معتقد تخلص کرتے ہیں۔ ان کے دیوان میں تقریباً دو ہزار شعر ہیں۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت کتب غیبت اور احادیث رجعت کے مطالعے میں صرف کیا ہے اور اس باب میں تقریباً ساٹھ ہزار بیت لکھ چکے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک کتاب عربی میں لکھی ہے جس کا نام ''دلائل الظہور و علائم الحضور'' ہے۔ ایک اور کتاب کشکول کی قسم سے تالیف کر کے ''مجموعۃ الطائف'' اس کا نام رکھا ہے۔

معتقد کو امام عصر حضرت مہدی آخر الزمان کی زیارت کا اشتیاق، آپ کی غیبت کا غم اور ظہور کا انتظار اس قدر رہتا تھا کہ لوگوں کو ان پر جنون کا شبہہ ہونے لگا تھا۔ ''جواہر الزواہر'' میں ان کی دو نظمیں ہیں، جن کے عنوان حسب ذیل ہیں:

۱۔ اظہار ندبہ و تاسف از طول غیبت و تغیر طباع مردماں و دعای تعجیل در ظہور امام علیہ السلام۔

۲۔ در تضرع و تاسف در طول غیبت و اظہار اشتیاق و شکایت از اہل زمان در خدمت آنجناب،

دوسری نظم کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

الا ای اختر برج ولایت	یگانہ گوہر درج ولایت
بہ مغرب جلوۂ چون صبح اول	نمودی و شد آن جلوہ اول
چو صبح دویمین کن جلوۂ باز	ز خورشید رخت روشن جہان ساز
تو نخل احمدی من نسل سلمان	نجاتم دہ ز قوم نا مسلمان
بہ تصدیقت مرا تکذیب کردند	گہم تکفیر و گہ تعذیب کردند

یکی گفتی فلان دیوانه گشته	ز راه عقل و دین بیگانه گشته
ز عمرم رفته اکنون پنحه و پنج	چهل زان گشته صَرف این غم و رنج
مرا زین بیشتر در انتظارت	مسوز ای منتظر جانها نثارت
سر افرازم میان نیك و بد کن	یکی از جملهٔ خاصان خود کن

''جواہر الزواہر'' میں شروع میں متعدد قصیدے ائمہ اور بزرگان دین بالخصوص امیر المومنین کی مدح میں ہیں۔ تقریباً ہر قصیدے کے آخری حصے کو واقعاتِ کربلا سے ربط دے کر مرثیہ کر دیا ہے۔ ایک قصیدہ ناصر الدین شاہ قاچار کی تعریف میں ہے، دو قصیدوں میں ۱۲۸۷ھ کے قحط کا بیان ہے۔ جس کی تاریخ یوں نکالی ہے:

هشتادو هفت بعد هزار و دویست بود	تاریخ نیز "رمز غم" آمد برین گوا

ایک قصیدے میں سات معجزوں کا ذکر ہے جو ۱۲۹۹ھ میں نجف اشرف میں ظاہر ہوئے تھے، ان کی تاریخ یوں بتائی ہے:

از هزار و سیصد هجری یك در صفر کم	این معاجز شد عیان در محضر جمع ثقات

قصیدوں کے بعد متعدد مخمس ہیں جن میں سعدیؔ کی غزلوں اور وصالؔ کے مرثیوں کی تضمین کی ہے۔ ان کے بعد چند مرثیے ہیں، بعض مثنوی کی شکل کے بعض قصیدے کی شکل کے اور ایک مسدس ہے، ایک ہفت بند ہے، جس میں امام موسیٰ کاظمؑ کے مناقب و مصائب بیان کئے گئے ہیں۔

معتقدؔ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ذی علم شخص ہے۔ فارسی زبان پر اس کو بڑا عبور اور الفاظ پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اس کے قصیدوں میں قاآنیؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایک قصیدہ ایک نئی صنعت میں کہا ہے۔ اس کے شعروں کے پہلے مصرع میں حروف تہجی اصل ترتیب سے آئے ہیں یعنی الف، ب، ت، ث، ج، ح، وغیرہ تا ی اور دوسرے مصرعے میں حروف تہجی معکوس ترتیب سے آئے ہیں یعنی ی، ہ، و، ن، م، ل وغیرہ تا الف۔ اس قصیدے کے ابتدائی چھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

الف قامت من گشته ز عشق تو چو دال — یاد من گه نه کنی ای مه خورشید جمال

برق مهر تو مرا سوخته خوش خرمن صبر — هجر روی تو مرا سوخته از ناله چو نال

تنگ گشته به من غم زده صحرای جهان — وه تو خوش می گذرانی شب و روز و مه و سال

ثبت شد روز ازل در ورق دفتر عشق — نام من با غم هجران تو ای تازه نهال

جان من شیفتهٔ خال ز نخدان تو شد — مرغ دل هم پی آن دانه فتادش دنبال

حلقهٔ موی دلاویز تو یا شام فراق — لالهٔ روی طرب خیز تو یا صبح و صال

معتقدؔ کے ایک مرثیے کے چند شعر اور مسدس کے دو بند نقل کئے جاتے ہیں:

چون شاه دین ز باره مکان بر زمین گرفت — زین غصه لرزه بر تن عرش برین گرفت

غلغل فتاد در غرفات جنان تمام — شور نشو در فلك هفتمین گرفت

گرد ملال بر رخ روح الامین نشست — آتش چو در خیام شهنشاه دین گرفت

معجر ربود از سر زینب ستمگری — خورشیداز ین معامله کف بر جبین گرفت

خاموش معتقدؔ که ازین غصه در چمن

آتش بشاخ سرو و گل و یاسمین گرفت

ای فلك چند لوای ستم افراختهٔ — تا بکی کینه وری شیوهٔ خود ساختهٔ

نسل خیر البشر از اصل بر انداختهٔ — پور هند از پسر فاطمه نشناختهٔ

آتش کین بصف ماریه افروختهٔ

جگر فاطمہؑ از داغ حسینؑ سوختهٔ

هر چه غم بود و الم قسمت زینبؑ کردی — ساغر عمر وی از غصه لبالب کردی

روزش از مرگ حسینؑ تیره و چون شب کردی — شمر را مونس آن سوخته کوکب کردی

شادر وزی نشد از تو دل ناشاد حسینؑ

شد عزا از ستمت شادی داماد حسینؑ

سرباز بروجردی:

اسمٰعیل خان سرباز بروجردی کی کتاب ''اسرار شہادت'' ناصر الدین شاہ کے عہد میں مقرب الخاقان میرزا محمد شفیع مستوفی دیوان اعلیٰ کی فرمائش سے ۱۲۷۵ھ میں کارخانۂ آقا محمد، یزد میں چھپی، غلام رضا حیراں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ مصنف نے کتاب کے خاتمے پر ''سبب نظم کتاب'' بتایا ہے ، جو مختصراً حسب ذیل ہے:

دارم از فیض خداوندِ مجید — منصب مداحی شاهِ شهید
فیض شاه دیں حسینؑ تشنه لب — یار دل گردید با من روز و شب
لیك مردی از غلامان علیؑ — نور ایمان درد رونش منجلی
نام او موسیٰ و در طور عزا — آتشش در جان سربازار صفا
باعث انشای این خونین کلام — گشت آن مرد نکو خود و السلام

اس ضخیم کتاب میں معصومین کی مدح میں قصیدے ہیں۔ ان کی وفات اور شہادت کا بیان ہے۔ واقعات کربلا کا تفصیلی حال ہے، امام حسینؑ کے انصار واعزہ میں ایک ایک کی نام بنام شہادت کا ذکر ہے، کتاب نظم میں ہے، لیکن جابجا تھوڑی نثر بھی شامل ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں مرثیے ہیں۔ پہلے ''دوازدہ بند'' ہیں۔ ایک کا عنوان ہے ''دوازدہ بند من کلام سرباز بروجردی'' اور دوسرے کا عنوان ہے ''دوازدہ بند من کلام سرباز بطرز محتشم'' اس دوازدہ بند کا پہلا بند حسب ذیل ہے:

باز این چه جوش گریه چه افغان چه ماتم است — این شیون از چه روی بخلق دو عالم است
بانای و ناله هر زن و مردی به حلقهٔ — آهنگ آن چو نالهٔ حوا و آدم است
بر پا چراست شور قیامت به هر زمین — ز افغان خلق غلغله تا عرش اعظم است
خورشید چارمین فلك از مشرق عزا — در خون ز آب دیدهٔ عیسیٰ بن مریم است
لوح وجود حضرت خیر البشر نگر — از خون دیده دفتر دیباچهٔ غم است

روح القدس بہ قبہ فیض کبریا — چون شمع در گلو و سر شکش دما دم است
گفتم بہ جبرئیل خراش دلت ز چیست — گفتا ز ناخنی کہ ھلال محرم است
سر باز بین چسان ز غم گیسوی حسینؑ — کار جهان و خلق جهان جملہ درهم است

شاهنشہ دیار بلا مهر مشرقین
شمع حریم محفل غم حضرت حسینؑ

سر بازؔ کا ایک مرثیہ ترجیع بند ہے۔ ایک مقتل کے واقعات کے طرز کا ہے اور بہت سے مختصر مرثیے غزل کی شکل کے ہیں، جن میں اکثر کسی مشہور شعر یا مصرعے کو تضمین کیا ہے۔ جس مرثیے کا عنوان ''اشعار بطرز مقبل'' ہے، اس کے کچھ شعر پیش کیے جاتے ہیں:

ھلال ماہ محرم بہ آسمان عزا — خراش ناخن غم زد بہ مغرب دلها
بہ پشت عیش فلك کردو این ماتم نیز — بہ چنگ زهره بشد مشتری غم آمیز
گریست دیدۂ انجم بحالت زهرا — شبی کہ بود طلوعش ز صبح عاشورا
سحر زدیدۂ پُر خون عیسی گردون — نشست همچو شفق آفتاب اندر خون
پی زیارت آن قدسیان عالم جان — ز آسمان بہ زمین آمدند نوحہ کنان

وفائیؔ شوستری:

ملا فتح اللہ وفائیؔ شوستری کے مجموعۂ کلام کے دو ایڈیشن میں نے دیکھے ہیں۔ ایک دیوان وفائی کے نام سے مطبع گلزار حسنی، بمبئی میں ۱۳۱۱ھ میں اور دوسرا کلیات وفائی کے نام سے مطبع مظفری بمبئی میں ۱۳۲۸ھ میں چھپا تھا۔ پہلا ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے سرورق پر وفائیؔ کے نام کے ساتھ طاب اللہ ثراہ (۱) کا فقرہ بتاتا ہے کہ اس وقت وفائیؔ کا انتقال ہو چکا تھا۔

ایک دوسری شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۳۰۴ھ سے پہلے انتقال کر چکا تھا، ملا حسین حقیرؔ

(۱) طاب اللہ ثراہ: خدا اس کی قبر کو معطر کرے۔

دزفولی نے شعرائے دزفول وشوستر کے قصائد ومراثی کا مجموعہ جو ۱۳۰۴ھ عہد ناصر الدین شاہ میں مخزن الدرر(۱) کے نام سے مرتب کر کے محرم ۱۳۰۵ھ میں شائع کیا اس میں وفآئی کے نام کے ساتھ لفظ مرحوم لکھا ہے، ناصر الدین شاہ کا عہد حکومت ۱۲۶۵ھ سے ۱۳۱۴ھ تک تھا، گمان غالب ہے کہ وفائی اسی عہد میں گزرا ہے۔

وفآئی کا ایک مخمس جناب امیرؑ کی مدح میں ہے، اس کے مندرجہ ذیل بند سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قیام اپنے وطن شوستر میں تھا۔

عنان اختیار من ربوده عشق او ز کف   بـه اختیار خویشتن دو اندم به هر طرف

گهی به طوس می کشد مرا و گاه در نجف   چه دست ، دست او بود زهی سعادت و شرف

اگرچه در وطن بود که هست ملك شوشترا

اس نے کہیں کہیں اپنی پیری کا ذکر کیا ہے مثلاً ''شد پیر وفائی بہ رہ مہر وفایت''، ایک قصیدہ نجف اشرف میں امام رضاؑ کی خدمت میں عریضے کے طور پر لکھا ہے۔اس کے اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا در رسیدہ تھا، اس کی سولہ اولادیں مر چکی تھیں:

تیر انداز قضا را شد دل و جانم هدف   کشتـه ام آمـاج پیـکـان قدر لیل و نهار

نیستم من کوه کاهم در طریق تند باد   برگ کاهی را چه باشد و زن و قدر و اعتبار

من نه ایوب و نه یعقوبم که بار غم کشم   مـی نـه شـایـد کردبار فیل را بر پشّه بار

آنچه من دیدم کجا ایوب و کی یعقوب دید   ای دوصد ایوب و یعقوب از شما امیدوار

شـانزده فرزند از من رفته چون گل برگ تر   کز غـم هر یك ولی چون لاله دارم داغ دار

گر غم ما را به عالم سر بسر قسمت کنند   یك دل خـرم نـمـانـد در تـمـام روزگـار

---

(۱) مخزن الدرر میں گیارہ شاعروں کا منتخب کلام شامل ہے، جن کے نام یہ ہیں، شیخ محمد حسن طویل، شیخ عبدالحسین بہار، شیخ محمد باقر شیدا، سید عبدالکریم ناطق، ملا محمد رشید ضیائی، سید حسین فارغ، ملا حسین حقیر، شیخ محمد رضا جن کا کوئی تخلص نہیں، سید محمد باقر بہا، ملا فتح اللہ وفائی، ملا صالح صالح و عطارد، ان میں شروع کے آٹھ شاعر دزفولی ہیں اور آخر کے تین شاعر شوستری ہیں۔

وفائی کے ایک مخمس کا عنوان ہے "در سال طاعون در نجف اشرف بخدمت امیر مومنین عرض شد" اس مخمس کا پہلا بند حسب ذیل ہے:

المنتہ للہ کہ بہ کوی تو مقیمم — در بار گہت چون سگ اصحاب رقیمم

ھر دم رسد از حلقۂ زلف تو نسیمم — ای خاك درت جنت و فردوس نعیمم

صد شکر ز آغاز شدم نیك تر انجام

معلوم ہوتا ہے کہ وفائی آخر عمر میں نجف اشرف میں مقیم ہو گیا تھا۔

حاجی ملا اسمعیل فارس اور وفائی میں بڑی دوستی تھی، ایک مرتبہ فارس نے انیس شعر کا ایک قطعہ عجم سے وفائی کو شوشتر بھیجا۔ اس میں وفائی کی بہت تعریف کی اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

ای شاعری کہ چون تو سخن سنجی از علم — ننہادہ پا بہ دائرہ روزگارھا

اس کے جواب میں وفائی نے ۲۳ شعر کا قطعہ بھیجا، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ای فارسی کہ بر فرس طبع فارسی — ھستی سوارہ و دگران نی سوارھا

اس قطعے کی رسید میں فارس نے سولہ شعر کا قطعہ بھیجا، جن کے آخری تین شعر یہ ہیں:

ھر کہ دید آن نامہ و گفتار و خط — گفت ما ذا انہ شی عجاب

این سخن گو کیست یا رب کز و مش — مغز گیتی پر شد از بوی گلاب

این وفائی قبلہ گاہ فارس است — کز غشون آتش بر انگیزد ز آب

وفائی کے دیوان میں کل ۱۲۰ صفحے ہیں۔ ۷۳ صفحوں میں ائمہ اور بزرگاردین کی مدح میں قصیدے ہیں، ان قصیدوں کے درمیان میں تین مخمس بھی ہیں، اکثر قصیدوں کے آخری حصے میں واقعات کربلا کا بیان ہے، اس لئے ان کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں، قصیدوں کے بعد ۲۳ صفحوں میں مرثیے، ۵ صفحوں میں رباعیاں، ۱۲ صفحوں میں غزلیں اور ۶ صفحوں میں قطعے وغیرہ ہیں۔

وفائی کو حضرت علیؑ سے عقیدت میں بہت غلو ہے۔ایک قصیدے کے چند شعر سنیے۔اس قصیدے پر قاآنی اور قرۃ العین دونوں کا اثر نمایاں ہے:

چه شود ز راه محبت از نظری بجانب ما کنی　　که به کیمیای نظر مگر مس قلب تیره طلا کنی

یمن از عقیق تو آیتی چمن از رخ تو روایتی　　شکر از لب تو حکایتی اگرش چو غنچه تو وا کنی

به شکنج طرهٔ عنبرین که به مهر چهر تو شد قرین　　شب و روز تیرهٔ این حزین تو بدل به نور و ضیا کنی

تو مراد من تو نجات من به حیات من به ممات من　　چه ضرر کنی چه زیان بری که بر آوری و عطا کنی

تو چرا الست بربکم نه زنی بزن که اگر زنی　　ازل و ابد همه ذره ذره پر از صدای بلی کنی

تو به شهر علم نبی دری تو ز انبیا همه برتری　　تو غضنفری و تو صفدری چو میان معرکه جا کنی

ز خلوت چتر و علم زنی قدم از قدم بعدم زنی　　به عدم تو نقش و رقم زنی و بنای هر دو سرا کنی

من اگر خدای ندانمت متحیرم که چه خوانمت　　که اگر خدای بدانمت تو بری شوی و ابا کنی

شب و روز را تو مدبّری تو مقدّری تو منوّری　　که مساء را تو کنی صباح و صباح را تو مسا کنی

اس قصیدے میں جو ترنم ہے وہ ظاہر ہے۔ایک قصیدے کا مطلع اور ملاحظہ ہو:

طبع شرر فشانم از شعله ز آذر آورد　　بلبل نطقم از کجا طبع سمندر آورد

وفائی امام حسینؑ پر گریہ و ماتم کے بغیر زندگی کو بے کیف اور بے رونق سمجھتا ہے اور اپنے اس خیال کو بڑے پُر زور انداز میں یوں ظاہر کرتا ہے:

ای تشنهٔ که از اثر اشك ماتمت　　تا روز حشر گلشن دین سبز و خرم است

گویند در بهشت برین جای گریه نیست　　گر نیست گریه بر تو مرا جای ماتم است

هر جا که ماتمت بود آنجا بهشت ماست　　جائی که نیست ماتمت آنجا جهنم است

مراثی وفائی سے دو مقام پیش کیے جاتے ہیں:

حضرت علی اکبر کی رخصت اور جنگ:

هفتاد تن ز عشق چو از ما در اوفتاد　　پس قرعه اش بنام علی اکبر او فتاد

شور شهادتش بسر افتاد پس بکف — بنهاد سر بپای پدر با سر او افتاد

گفت ای پدر ترا نتوانم غریب دید — از بی پناهیت بدلم آزر او فتاد

قربانیٔ منای وفائ تو ای پدر — از تشنگی ست گرچه چنین لاغر او فتاد

اما بعرصه گاه نبرد ای پدر ببین — این شیر بچه را که مگر اژدر او فتاد

پس از پی وداع حرم شوی خیمه رفت — آنگه بخیمه شورش چون محشر او فتاد

بهر وداع حلقه زنان دور او زنان — گفتی ز هاله گرد قمر چنبر او فتاد

بر حال آن ذبیح چو لیلی نظاره کرد — در اضطراب و واهمه چون ها جرا فتاد

گفت ای جوان نور سم آیا چه واقع است — شور شهادتت مگر از در سر او فتاد

از من جدا مشو تو که هر گز بروزگار — فرزند چون تو نه ز چو من ما در او فتاد

ما را فراق جسم ز جان گرچه مشکل است — اما فراق روی تو مشکل تر او فتاد

اندر خیال خال لبت ای پسر دگر — دل همچو عود و سینه مگر مجمر او فتاد

گفتش نظر نما و ببین زادهٔ بتول — در جنگ خصم بیکس و بی مادر او فتاد

بعد از حسینؑ دگر بچه کار آیدت پسر — بگزار و بگزرا زچه بی نادرا او فتاد

فرزند تست قابل قربانی حسینؑ — بهر تو نزد حق چه از این بهتر او فتاد

رخصت گرفت و رفت و زدو کشت و می فگند — نوعی که شور حشر در این لشکر او فتاد

در عرصهٔ نبرد ز شمشیر او بسی — تن های بیسر و سر بی مغفر او فتاد

شد عرصه گاه جنگ بر اهل نبرد تنگ — از بس بروی هم بزمین پیکر او فتاد

حضرت عباسؑ کی شہادت: آپ کے دونوں شانے قلم ہو چکے ہیں۔ مشک پر تیر لگ چکا ہے اور پانی بہہ چکا ہے، اس وقت:

پس خود برای کشته شدن ایستاد و گفت — مردن هزار مرتبه بهتر که شرمسار

آن گه عمود و نیزه و شمشیر و چوب و سنگ — شامی بر او ز دی زیمین کوفی از یسار

پس سرنگون ز خانۂ زین گشت بر زمین
فریاد یا اخا ز جگر بر کشید زار

فریاد یا اخا چو بگوش حسینؑ رسید
گفتی مگر هژبر روان شد پی شکار

آمد چه دید دید که بی دست پیکری
افتاده پاره پاره در آن دشت فتنه بار

آهی ز دل کشید و بگفت ای برادرم
عباس ای که از پدرم مانده یادگار

امروز روز یاری و روز برادری است
از جای خیز و دست به همدستیم بر آر

ایک سال عاشورا اور نوروز ایک ہی دن پڑ گئے، اس موقعے پر وفائی نے ایک مرثیہ کہا جس میں بہار کے مظاہر کو غم کے مناظر اور واقعات کربلا کی یادگاروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چند شعر بلی ترتیب پیش کیے جاتے ہیں:

غم امسالم افزون تر ز پار است
که در ماه محرم نو بهار است

مصیبت بیشتر باشد جگر سوز
که باشد روز عاشورا به نو روز

چو عاشورا و نوروز اند با هم
مهیا تر بود اسباب ماتم

بلی گر آتشی باشد به خرمن
نسیمش شعله و رسازد بد امن

ز غم گر خاطری باشد مشوش
نو ای نی زند بر جانش آتش

بهار امسال خود باشد عزادار
عزاخوان بلبلان در طرف گلزار

حکایت می کند سر و وصنوبر
ز سر و قامت عباس و اکبر

به نیلو فرنگر کو چون سکینه است
رخش نیلی ز سیلی های کینه است

به نرگس بین که همچون چشم زینبؑ
ز حسرت مانده باز از صبح تا شب

ز بس صحن چمن پر ارغوانست
تو گوئی قتل گاه کشتگانست

شبابؔ شوشتری:

ملا عباس شبابؔ شوشتری ایک قدیم شریف خاندان سے تھا۔ اس کے اجداد زیادہ تر تاجر تھے۔ وہ خود عطاری کا پیشہ کرتا تھا۔ اس نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا، مگر اس کے والد اس کو شعر کہنے

سے منع کرتے تھے۔ اس لئے جب تک وہ زندہ رہے شباب ان سے چھپا کر شعر کہتا رہا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد کچھ دن خانہ داری کے جھگڑوں اور حصول معاش کی فکروں میں گرفتار رہا پھر کبھی کبھی غزل یا قصیدہ کہہ لیتا تھا اگرچہ اس کے اشعار اس وقت بھی بہت متین ہوتے تھے مگر اس کو کوئی شہرت حاصل نہ تھی۔

ایک مرتبہ عید کے موقع پر اس نے ایک قصیدہ جناب امیرؑ کی مدح میں کہا اور ایک روضہ خوان نے اس کو شیخ محمد جعفر مجتہد کے امام باڑے میں پڑھا۔ عالموں، امیروں اور ہر طرح کے ممتاز لوگوں کا مجمع تھا۔ سب اس قصیدے کو سن کر وجد کرنے لگے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ ایک نوعمر لڑکا ہے جو عطاری کا پیشہ کرتا ہے۔ شیخ نے بہت تاکید کے ساتھ کہا کہ اس لڑکے کو میرے پاس لاؤ۔ شبابؔ سے کئی مرتبہ کہا گیا مگر وہ شیخ کے رعب کی وجہ سے نہ گیا۔ آخرکار شیخ نے فرمایا کہ اگر وہ نہ آئے گا تو میں خود اس کے پاس جاؤں گا۔ جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو ایک دن شبابؔ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شیخ بڑی مہربانی سے پیش آئے اور ایک قیمتی عبا اور چند تومان اس قصیدے کے صلے میں دیئے۔

اس واقعے سے شبابؔ کی شہرت کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت تک اس کا کوئی تخلص نہ تھا۔ شیخ نے شبابؔ تخلص قرار دیا۔ اس کے بعد شبابؔ اپنے اکثر قصیدوں میں شیخ کی مدح کرتا تھا اور صلہ پاتا تھا۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ محمد علی بھی شبابؔ کے ساتھ اپنے والد مرحوم کی طرح مہربانی سے پیش آیا کئے۔

ایک مرتبہ شباب نے ایک قصیدہ شاہزادہ معزالدولہ کے حضور میں پیش کیا۔ اور اسے خود پڑھا۔ شاہزادہ اس قصیدے سے اور خاص کر شبابؔ کے طرز خواندگی سے بہت خوش ہوا اور خلعت اور انعام عطا کیا۔ چند روز کے بعد شیخ محمد جعفر اور شاہزادہ معزالدولہ کے باہمی مشورے سے طے ہوا کہ شبابؔ کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ فکر معاش سے سبک دوش ہو کر عربی کی تعلیم حاصل کر سکے۔ اس مشورے

کے مطابق شباؔب مدرسے میں داخل کر دیا گیا، مگر اس کا وہاں دل نہ لگا اور تعلیم کا سلسلہ تھوڑے ہی دنوں میں منقطع ہو گیا۔

شباؔب کو اپنے کاروبار میں مصروفیت اور شعر و سخن میں مشغولیت کے سبب سے مطالعۂ کتب کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک کتاب تھی جو اس نے کسی سے مانگ لی تھی یعنی کلیات قاآنی جس کو کبھی کبھی دیکھتا تھا اور قاآنی کے قصیدوں پر قصیدے کہتا تھا، اس نے حسب ذیل قطعہ قاآنی کی تعریف میں کہا ہے:

در بر فکر بکر قاآنی	برتو بنده شاعری غلط است
پنجه با او زدن بدعوی فضل	غوطه خوردن چو در شتابه شط است
آب حیوان سواد کلکش را	جاری از چشمه سار هر نقط است
نظم سحر است اگر ازین قبل است	نثر وحی است اگر ازین نمط است
مادر طبع را بہ حجلۂ فکر	زو پسرها و دیگران سقط است
مثل او بحار موجۂ نظم	بادگر شاعران نهنگ و بط است
هر که او بر خلاف این دعوی است	خارج از شش جهات و هفت خط است

شباؔب کا کلیات اس کے دوست سید محمد شوستری نے ۱۳۰۹ھ میں مرتب کر کے اس پر دیباچہ لکھا اور خود اپنے ہاتھ سے اس کی دیدہ زیب کتابت کر کے بہت بڑے سائز پر حسب فرمائش حاجی محمد حسن شوشتری تاجر ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) میں بمبئی میں چھپوایا۔ اس کی تقطیع اتنی بڑی ہے کہ روشن خط کے چار مصرعے ایک سطر میں آ گئے ہیں۔ اس کے متعدد صفحوں پر نقاشی کا بہت باریک کام ہے اور پوری کتاب طباعت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے، شباؔب کے جو حالات اوپر لکھے گئے ہیں وہ اس کے کلیات کے دیباچے سے لئے گئے ہیں۔ کلیات شباؔب میں ۳۰۶ صفحے ہیں اور اصناف سخن کی ترتیب اور مقدار حسب ذیل ہے:

مثنویات ۴۵ صفحے، قصائد ۱۹۱ صفحے، مراثی ۲۲ صفحے، غزلیات ۲۹ صفحے، قطعات ۷ صفحے، رباعیات ۴ صفحے۔ قصیدے مقدار میں کل کلام کا دو تہائی حصہ ہیں اور بیشتر مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کی مدح میں ہیں۔ ان میں بھی بہت زیادہ تعداد ان قصیدوں کی ہے جن میں حضرت علیؑ کی مدح کی گئی ہے۔ بادشاہ وقت ناصرالدین شاہ قاجار اور شاہزادوں، امیروں، حاکموں، عالموں وغیرہ کی تعریف میں بھی بہت سے قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ مقرب الخاقان امین الضرب (یعنی ناظم دار الضرب شاہی) حاجی محمد حسن کی مدح میں ہے، جنہوں نے تقریباً چالیس ہزار تومان ایرانی خرچ کر کے بحارالانوار مصنفہ علامہ مجلسی کی کل جلدیں چھپوا کر وقف کر دی تھیں، اس قصیدے کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

در بحارت بحر جود آمد به طغیان کز ازل — این گهرهای معانی را تو بودی مشتری

بحر نور از ابر احسان تو جاری شد بدهر — هست از آن نهری بهر شهر از پی دین پروری

در جزای این عمل از حق نه میدانم بحشر — مجلسی را با تو باشد همسری یا برتری

او علم بر علم و فضل آمد تو بر احسان و بذل — زاین صفتها چیست به جز رتبهٔ پیغمبری

اسی قصیدے میں شباؔب مشہد سے پانچ مہینے کے بعد تہران واپس آنے کا ذکر کرتا ہے اور وطن پہنچنے کے لئے سفر خرچ کی ضرورت ظاہر کرتا ہے:

بنده بعد از پنج مه از درگه دار ای طوس — کرده ام رجعت سوی طهران چو مهر خاوری

هستم از بهر وطن کشتی صفت در بحر فکر — گاهی از بی بادبانی گاهی از بی لنگری

بادبان مال سواری لنگر آمد خرج راه — زانکه بی این هر دو کس نتوان روا در کشوری

اس قصیدے کے اشعار ذیل میں بحارالانوار کے ایک دورے کے لئے حسن طلب مضمر ہے:

نی زاهل فضل و علمم تا باستدلال عقل — خلق را از جنت و دوزخ کنم یادآوری

تا بگویم از بحارم دورهٔ ده تا کنم — در طریقت سرفرازی در شریعت مهتری

هستم اندر کنج غربت فارغ از اغیار ویار
کسب و کردارم دعا گوئی شعارم شاعری

ایک قصیدہ حر شہید کی مدح میں ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

شب گزشتہ نہادم بعزم استہلال
بستی آئینہ در پیش و دستی آب زلال

مدح کے چند شعر درج ذیل ہیں:

سعادت آمده با شخص فطرتش هم عهد
شهادت آمده با طفل همتش هم سال

به هم عنانی اورشك می برد شوکت
به هم رکابی او فخر می کند اقبال

چه مدح گویمت ای پادشاه ملك هنر
چه وصف خوانمت ای آفتاب چرخ جلال

به مغز کافر اگر بوی تربت تو وزد
کند بهشت ز صد ساله راهش استقبال

ز تفّ تیغ تو اطباق خاك را تب و تاب
ز لهب رُمح تو ارکان کوه را زلزال

مناعت آمده در دست خلقتت یاره
شجاعت آمده دریای فطرتت خلخال

کمیت عقل در اقطاع قد رجاه تو لنك
زبان وهم ز تبلیغ عزوشان تو لال

گرت ز خون گلو چهره آل شد چه عجب
که سرخ روئی از آن یافتند حیدر و آل

به نیم قطره که خصم از تو بست آب روان
بسا شگوفهٔ راحت که روید از اعمال

چه سالها که بیابی وصالهای امید
بدین وسیله که بگزشتی از وصال عیال

باقتضای سعادت ببین که شاهد بخت
چه جلوه ها که نمود از فروغ حسن مآل

خطائ را به تقاضای نفس لازم شد
پس از لزوم ندامت چه نقص اهل کمال

به دیگران نه تو ان حمل کرد همت تو
که کوه های گران بر نتابد این احمال

ز لال کوثرت آماده است و شُرب رحیق
به شرم ساری بر گشتن از طریق ضلال

بخاك تیره نظر داشتن ز خجلت و دست
غبار کوی تو موصوف شد به استکحال

آخر کے دو تین شعروں میں امام حسینؑ کے مصائب بیان کئے ہیں:

بدان زمین نه مُعینی که باشدش همدم
در آن دیار نه یاری که پُرسدش احوال

عذار اکبرش از خون فرق خود رنگین　　به لعل اصغرش از تاب تشنگی تبخال

شبابؔ شرح غم کربلای شاهِ شهید　　زهی تصور باطل زهی خیال محال

شبابؔ نے بعض علما اور امرا کے مرثیے بھی کہے ہیں۔ شہدائے کربلا کے مرثیے تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ دو مرثیے دوازدہ بند اور ایک شش بند مرثیہ محتشم کی بحر میں ہیں، ایک پانزدہ بند دوسری بحر میں ہے، دو مخمس مرثیے ہیں ایک طبع زاد اور ایک مرثیہ محتشم کی تخمیس، ایک بند شہادت علی اصغرؑ کے بیان میں اور پانچ مرثیے غزل کی شکل کے ہیں، ذیل میں ایک دوازدہ بند کا ایک بند اور طبع زاد مخمس کے تین بند درج کئے جاتے ہیں:

بگشود چون ز کشتن آن شاه کم سپاه　　دشمن کمر به بست به تاراج خیمه گاه

نه شرم از آن قتیل که در خاك و خون تپان　　نه بیم از آن علیل که حال از تپش تباه

یك جا یتیمه ای لبش از تشنگی کبود　　یك جا ضعیفه ای منش از کعب نی سیاه

فوجی بچنگ حادثه مغلوب و مستمند　　قومی بقید سلسله مظلوم و بی گناه

نالان ز درد غربت و گریان ز جور خصم　　چون عندلیب بر گل و چون ابر بر گیاه

نه داوری که تا شود آن یك بر او دخیل　　نه یاوری که تا برد این یك بر او پناه

روزی ود و شبی مه بخون غرقه ماه دین　　زخم تنش چوذره و خود مهر چاشت گاه

بگشوده هر جراحتش از تن دو صد زبان　　بر بی گناهیش بر خصم از بی گناه

دانی بر آل فاطمه کردی چها فلك　　آه از تو سنگ دل که چه نامهربانی آه

فریاد از آن زمان که پیمبر بروز حشر　　گردد ز بهر عترت خود از تو داد خواه

آن لحظه گر نه لطف الهی ضمان شود
یك شعله برق خرمن کون و مکان شود

☆☆☆☆☆

زینب غم زده گفت ای شه والا گهرم　　بسته دشمن ز سر کوی تو رخت سفرم

بی تو جان میرود از پیکر و خون از جگرم　　می روم و ز سر حسرت به قفا می نگرم

خبر از پای نه دارم که زمین می سپرم

شب و روزم بدل اندیشهٔ روز و شب تست گوش جان داده بر آوازِ سُم مرکب تست

نور چشم ترم از روشنی کوکب تست جانمن زنده ز تاثیر هوای لب تست

سازگاری نه کند آب و هوای دگرم

می خورم خون جگر دم به دم از خوان اجلق مانده ام گوی صفت در خم چوگان اجل

چشم در اه فنا گوش به فرمان اجل چه کنم دست ندارم به گریبان اجل

تا زغم برتن خود پیرهن جان بدرم

سب سے طولانی مرثیہ وہ ہے جس میں دوازدہ بند محتشم کی تخمیس کی ہے۔ اس میں ۹۴ مخمس بند ہیں، چند بند پیش کئے جاتے ہیں:

آل نبی چو در صفِ محشر قدم زنند در پیش داور ازستم خصم دم زنند

ز آه و فغان قیام قیامت بهم زنند ترسم جزای قاتل شان چون رقم زنند

یکباره بر جریدهٔ رحمت قلم زنند

آه از دمی که با سر پر خون و جسم چاك آه از دمی که بادل بریان و شعله ناك

آه از دمی که با رخ رخشان چو جان پاك آه از دمی که با کفن خون چکان ز خاك

آل نبی چو شعلهٔ آتش علم زنند

نالد زمانه بر دل نالان اهل بیت سوزد فلك ز سینهٔ سوزان اهل بیت

گرید ملك به دیدهٔ گریان اهل بیت فریاد از آن زمان که جوانان اهل بیت

گل گون کفن به عرصهٔ محشر قدم زنند

کردند بعد قتل شه آغاز ترك تاز بر خر گهه شهنشه دین خسرو حجاز

با این عمل به درگه دارای بی نیاز از صاحب حرم چه توقع کنند باز

آن ناکسان که تیغ به صید حرم زنند

حبیبؔ کردستانی:

سید حبیب اللہ ابن سید اسماعیل قاری کردستانی کا مجموعۂ کلام ''حبیب الاوصاف'' ناصر الدین شاہ قاجار کے زمانے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ناصر الدین شاہ اور دیگر منصب داران دربار کی شان میں بھی متعدد نظمیں ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ناصر الدین شاہ کے زمانے میں موجود تھا۔ اس مجموعے میں متعدد مرثیے بھی ہیں۔ زیادہ تر قصیدے کی شکل کے، دو تین مثنوی اور مخمس کی شکل کے بھی ہیں۔ آخر کے قریب محتشم کے مشہور مرثیے کے طرز کا ایک دوازدہ بند بھی ہے جس کی سرخی خود مصنف نے یہ قرار دی ہے:

''دوازده بند در مصیبت بروزن دوازده بند محتشم''

وزن اور شکل کے علاوہ اکثر بندوں اور سر بندوں میں ردیف اور قافیہ بھی وہی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور تفصیلات میں بھی محتشم کی تقلید کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ لکھنو یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

حبیبؔ کے ایک مرثیے کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

روز عاشورا حسینؑ چون کرد عزم کارزار
از غم بی یاریش چشم ملك شد اشك بار

یکه و تنها میان صد هزاران اشقیا
بی کس و بی مونس و بی همدم اندر آن دیار

هر طرف نظاره گرشد آن ولی حق پرست
نامدش اندر نظر جز لاله های داغ دار

قاسم وعباس و عون و جعفر و یاران او
جملگی غلطان بخون با اکبر نسرین عذار

باز بر گشت و نگه افگند سوی خیمه گاه
دید برجا نیست غیر از ناله های بی شمار

گه به دل داری اطفال و عیال و خواهران
گاه از نالیدن لیلای بی دل شد فگار

گاه بر آن جمع محزون ناله بنمود از درون
گاه بهر سید سجاد شد در اضطرار

گاه در فکر اسیری رفتن زینب فتاد
گاه اندر فکر عهد خویش با پروردگار

دست بر دست آشنا فرمود و گفتا آه آه — تا به کی بر حال طفلان بود باید بی قرار

وقت میدان رفتن است و موسم جان دادن است — عهد خود باید به پایان بُردن اندر این دیار

چشم پوشید از همه اهل و عیال و جان و سر — گفت من چیزی نه خواهم جز رضای کردگار

حبیبؔ نے ایک دوازدہ بند بھی کہا ہے، بروزن دوازدہ بند محتشم لیکن اس کے آخری دو بند مرثیۂ محتشم کی بحر میں نہیں ہیں، بیشتر بندوں میں قافیے اور ردیفیں بھی وہی ہیں، جو محتشم کے بندوں میں ہیں۔ ایک بند کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں:

کاش آن دمی که خیمهٔ آن شه نگون شدی — این چتر نیل گون فلك واژگون شدی

کاش آن دمی که غرق بخون گشت آل شه — غرق بلا سراسر دنیای دون شدی

کاش آن دمی که گشت نگون قد اکبرش — خود سر و قدّ جملهٔ عالم نگون شدی

کاش آن دمی که شاه دو عالم ز زین فتاد — چون موج بحر آب زمین بی سکون شدی

کاش آن دمی که داد سرو جان شه ازوفا — جان از تن خلایق عالم برون شدی

کاش آن دمی که گشت بخون غوطه ور امام — از عرش تا به فرش همه بحر خون شدی

امام حسینؑ کے حکم سے آپ کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کی کوفے کے لئے روانگی سے ان کی شہادت تک کے حالات ڈرامائی انداز میں پیش کئے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو، جب یہ خبر پھیل گئی کہ اہل کوفہ نے حضرت مسلم سے بیعت کر لی ہے اور عبید اللہ بن زیاد نے بھی یہ خبر سن لی تو وہ بغیر فوج ساتھ لئے ہوئے تنہا کوفے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے منھ پر سیاہ نقاب ڈال لی اور سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کیا تاکہ کسی کو اس سفر کی خبر نہ ہو۔ کچھ رات باقی تھی کہ وہ کوفے پہنچ گیا۔ دار الامارہ کا دروازہ بند تھا اس نے نعمان کو آواز دی کہ میں اہل حجاز کا سردار حسین ہوں، وہی حسینؑ جس کے ہجر میں تم دن رات بے چین تھے۔ یہ سن کر نعمان نے دروازہ کھول دیا اور قدم بوس ہوا۔ ابن زیاد دار الامارہ میں داخل ہو گیا۔ صبح کو جب بہت سے کوفی اور شامی آکر جمع ہوئے تو

اس نے نقاب الٹ دی۔ اس مجمع کو غور سے دیکھا اور:

به فرزند اشعث همان لحظه گفت   که تو ترک باید کنی خورد و خفت

کنون ترک یاران و احباب کن   ز خون کوفه را جمله سیراب کن

به سرداری لشکر بی حساب   نمودم من اینك ترا کامیاب

برو با گروه شقاوت شعار   به یاران مسلم بکن کارزار

به هر خانه آن شخص پنهان شود   همان خانه باید که ویران شود

کنم لشکراز بهر یاری طلب   ز شام و دمشق وز مصر و حلب

که این جنگ باید به آخر رسد   دم تیغ بر آل حیدر رسد

برزم حسین لشکر بی شمار   کنم جمع افزون ترا ز مور و مار

ز قتل جوانان آل رسول   سماواتیان را نمایم ملول

همین است مقصود من با یزید   که باید سر آل حیدر برید

به آل علی هر که باشد دخیل   به دوران بسازیم او را ذلیل

بجای قبا درع پوشش کنیم   به رزم حسینؑ جمله کوشش کنیم

نمائیم کاری درین روزگار   که تا آخرت باد چون یادگار

کنون مسلم اول بخون و بخاك   کشید و مدارید اندوه و باك

ز گفتار او لشکر آمد بجوش   ز قلب دلیران بر آمد خروش

پی قتل مسلم [illegible]   بشد شهر کوفه پر از گفتگو

حضرت مسلم کے حالات کو پیش نظر کرنے کے لئے آٹھ مرقعے بنائے گئے ہیں جن کے عنوان مصنف کے لفظوں میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ گفتگوی جناب ابا عبد الله الحسین علیه السلام با پسر عم خود مسلم بن عقیل

۲۔ معروض داشتن جناب مسلم کیفیت صیاد را بر جناب ابا عبد الله الحسین

۳۔رسیدن عبید اللہ بن زیاد در شب تار در کوفه و گفتگو کردن با نعمان

۴۔تصویر نماز خواندن جناب مسلم و اقتدا نمودن کوفیان و رسیدن لشکر بحکم ابن زیاد و گریختن کوفیان و تنها گزاشتن جناب مسلم را

۵۔رزم جناب مسلم با کوفیان

۶۔آب خواستن جناب مسلم از طوعه

۷۔افتادن جناب مسلم در چاه و گرفتار شدن آن بزرگوار

۸۔شهادت جناب مسلم

حضرت مسلم کے حال میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، جس طرح کی گفتگو لکھی گئی ہے اور تصویریں بنائی گئی ہیں، ان سب چیزوں پر نظر کرنے سے ان پر شبیہ گردانی کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے جو اس وقت ایران میں خواص وعوام میں بے حد مقبول تھی۔

مذکورہ بالا تصویروں کے علاوہ اس کتاب میں چند تصویریں اور بھی ہیں، جن کے عنوان یہ ہیں:

۱۔وداع کردن حضرت عباس جناب زینب خاتون را با اهل بیت

۲۔اذن جنگ خواستن جناب علی اکبر از پدر بزرگوارش و رفتنش به میدان اشرار

۳۔اذن جنگ خواستن حضرت قاسم از عم بزرگوارش جناب سید الشهدا علیه السلام

۴۔وداع نمودن جناب سید الشهدا اهل بیت اطهار را و رفتن آن بزرگوار به میدان گروه اشرار

سلیمان کرمانی:

درویش سلیمان کرمانی کا مجموعۂ کلام مظفر الدین شاہ قاجار کے عہد میں ''انیس العرفا'' کے نام

سے مطبع گلزار حسنی، بمبئی میں ۱۳۲۳ھ میں خود مصنف کے زیر اہتمام چھپا، اس کی تاریخ مصنف نے یوں بتائی ہے۔

ہزار و سیصد و عشرین و سہ تاریخ این مطلب بعہد حضرت والا مظفر شاہ سلطان شد۔ اس مجموعے میں قصیدے، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، مستزاد، بحر طویل وغیرہ سبھی اصناف سخن موجود ہیں۔ بہت سی نظموں میں واقعات کربلا کا بیان بھی ہے۔ لیکن کلام کے سرسری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بہت معمولی درجے کا شاعر تھا۔ اس کا کوئی مرثیہ یا کوئی دوسری نظم ایسی نہیں معلوم ہوتی جس کو یہاں نقل کرنا ضروری ہو۔

رجائی شیرازی:

حاجی سید محمد محسن مجتہد شیرازی نجفی متخلص بہ رجائی کا مجموعہ کلام "مفرح الفواد و مبکی العباد" کے نام سے مظفر الدین شاہ قاجار کے عہد میں ۱۳۲۴ھ میں مطبع گلزار حسنی بمبئی میں طبع ہو کر شائع ہوا۔ خود مصنف نے اپنا کلام ۱۳۲۰ھ میں جمع کر لیا تھا۔ مگر اس کی اشاعت سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ بعد کو ان کے بھتیجے سید محمد جواد صفائی نے اس کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس مجموعے میں پیغمبر اسلام اور ائمہ دین کی مدح میں قصیدے ہیں۔ ایک طولانی قصیدہ تہنیت ولادت حضرت فاطمہؑ میں عربی زبان میں ہے۔ دو ترکیب بند مرثیے ہیں جو صرف شکل اور بحر میں مرثیہ محتشم سے مشابہ ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مرثیے "نوحہ" کے عنوان سے ہیں، جو قصیدہ، مثنوی، مستزاد، اور مخمس کی شکل میں ہیں۔ ایک مرثیہ مسدس ہے جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہم قافیہ ہیں اور تمام بندوں کے چھٹے مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ یہ بیشتر مردف بھی ہیں۔ ایک ترکیب بند مرثیہ جو شہادت حضرت علی اکبر کے بیان میں ہے اس کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے:

لیلای داغ دیدۂ محجوبۂ حرم　　مجنون صفت بنالہ ای وای اکبرم
پروردمت بناز و ھمی کردم افتخار　　ناموس شاہ و مادر شہزادہ اکبرم

ای گوهر یگانۂ غلطان بخون و خاك	رفتی و دهر خاك سیه ریخت بر سرم
شاه است بی سپاه و بداغ تو مبتلا	ترسم نهد زمانه بدل داغ دیگرم
بعد از تو زندگی نتوانم بروزگار	هستی تو پیش چشم بهر جا که بگذرم
گر سوی آفتاب نظر افگنم به روز	این آفتاب طلعت آید به منظرم
سوی ستاره ها فگنم گر نظر بشب	این زخمهای پیکرت آید به خاطرم
سنبل به بنیم آید ازین کاکلم به یاد	بعد از تو گل نه روید و گلزار گومباد

حضرت علیؑ کی شہادت پر ایک نوحے کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ای ولی خون مظلومان غیاث مومنان	الامان	از ستمهای زمان
دامن محراب را دریای خون بنگر عیان	الامان	از ستمهای زمان
آن که بودی زیب بخش منبر و محراب دین	دل غمین	غرقۂ خون بر زمین
دشمن دین شادکام و سوده سر بر آسمان	الامان	از ستمهای زمان
آن که بودی تاج فرقش انّما و هل اتیٰ	شد دو تا	فرقش از تیغ جفا
از غمش شد چشم انجم چون محبان خون فشان	الامان	از ستمهای زمان

امام حسینؑ کی شہادت پر ایک نوحے کے چند شعر لکھے جاتے ہیں:

عرش اعظم خواهد افتد باز بر فرش زمین	یا امیر المومنین
می رسد شیون ز فرش خاك تا عرش برین	یا امیر المومنین
عالم کون و مکان یکباره شد ماتم سرا	از ثریا تا ثری
نالۂ افلاکیان با خاکیان باشد قرین	یا امیر المومنین
کشتی از موج بلا در کربلا چون بر شکست	گرد غم بر سر نشست
شور محشر بر خلایق در محرم شد یقین	یا امیر المومنین

مرتب کتاب سید جواد صفائی نے کتاب کے آخر میں ایک قصیدہ، پانچ مرثیے اور چند رباعیاں

اپنی تصنیف سے شامل کردی ہیں۔

رجائی ہندوستان آئے اور کچھ مدت یہاں مقیم رہے، لیکن متعدد دوسرے ایرانی شاعروں کی طرح وہ بھی قیام ہندوستان کو قید سمجھتے رہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے:

اندرین ماتم سرودم نوحه ای سلطان دین　　جان حزین　　دل برنج و غم قرین

تا رجائی را رهائی بخشی از هندوستان　　الامـــان　　از ستمهای زمان

محمد افضل سرخوشؔ:

سرخوشؔ کا نام محمد افضل اور اس کا آبائی وطن بدخشاں تھا۔ وہ شاہجہاں کے عہد میں ۱۰۵۰ھ میں کشمیر میں پیدا ہوا۔ لیکن اس کی تربیت علاقہ سرہند میں ہوئی، سرہند کے مشہور شاعر ناصر علی سے بچپن ہی میں دوستی ہوگئی اور دونوں ساتھ ساتھ مشق سخن کرنے لگے۔ آٹھ، نو سال کی عمر ہوگی کہ ایک خوبصورت خواجہ سرا کو دیکھ کر جس کے چاہ زنخداں پر خال سیاہ تھا یہ شعر فی البدیہہ کہا:

بر زنخدان تو خال سیهی افتاداست　　همچو دیویست که بالای چهی افتاداست

گیارہ سال کی عمر ایک حسین وجمیل رسن باز لڑکی کو دیکھ کر یہ رباعی کہی۔

آن دلبر بوالعجب که ماه زیباست　　بالای علم چو گل به شاخ رعنا است

نی نی غلطم که آفتاب محشر　　یك نیزه بر آمد و قیامت برپاست

اس رباعی سے ایک غلغلہ برپا ہوگیا اور ارباب ذوق سرخوشؔ کے والد کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اس لڑکے کے حال سے غافل نہ رہنا۔ یہ کچھ دنوں میں آفتاب کی طرح چمکنے والا ہے۔

سرخوشؔ ابتدا میں اپنے بڑے بھائی خیر الدین محمد متخلص بہ عجزیؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتا تھا۔ تھوڑے عرصے کی مشق کے بعد شاہ محمد علی ماہرؔ کا شاگرد ہوگیا، یہ استاد شاگرد کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ سرخوشؔ کا بیان ہے کہ میں شاہ ماہرؔ کا شاگرد ہوں اور شاہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ لیاقت کہاں کہ سرخوشؔ جیسے شاعر بے مثال کا استاد کہلا سکوں۔

ایک مجلس شعرخوانی میں سرخوش نے اپنا یہ تازہ مطلع پڑھا:

کی توانم دید زاهد جام صهبا بشکند　　　می پرد رنگم حبابی گربه دریا بشکند

کچھ مدت امرا کی سرکار میں ملازمت کرنے کے بعد شاہی ملازم اور صاحب منصب ہو گیا اور عمر کا زیادہ حصہ بڑی آسودگی سے بسر کیا۔

سرخوش کی طبیعت شروع سے درویشانہ تھی، آخر میں گوشہ نشین ہو گیا اور شاہ جلال کا خلیفہ اور سجادہ نشین ہو گیا، سرخوش کے شاگردوں میں شیخ سعد اللہ گلشن اور بندرا بن داس خوشگو نے کافی شہرت پائی۔

سرخوش نے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔ متعدد کتابیں اس کی تصنیف سے تھیں۔ اس کا دیوان بقول خوشگو ۴۵۰۰۰، اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن اب اس کے تذکرے کلمات الشعرا کے سوا شاید کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ وہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے:

"فقیر نیز در تعریف رسن بازی رباعی نوشته بود که بالاتحریر یافته"، همیشه پشیمان بود که چرا چنین معنی در مدح بزرگی بسته نه شد، آخر برای مرثیۂ امام حسینؑ توفیق یافته دوازده رباعی مثل دوازده غزل محتشم گفتهٔ در رباعی تلاش ها کرده وقتی که کوفیان سر مبارك امام بر نیزه روانهٔ شام نمودند در آنجا این طور بستم:

کردند چو کوفیان سوی شام روان　　　بر نیزه سر حسین شاه دو جهان

لرزید فلك که شد قیامت برپا　　　یك نیزه بر آمد آفتاب تابان(۱)

حاجی بابا معنی:

عہد عالمگیر کے اواخر میں کشمیر میں ایک شاعر تھا حاجی بابا جو معنی تخلص کرتا تھا، اس کے والد حاجی حیدر اپنے زمانے کے کاملین میں تھے۔ معنی لطف طبع اور حسن تلاش میں اپنے اقران سے نہایت ممتاز تھا۔ اس نے واقعۂ کربلا بڑی خوبی سے موزوں کیا ہے۔ اس کے چند شعر لکھے جاتے ہیں:

---

(۱) کلمات الشعرا، ص ۱۰۷ مع حاشیہ۔

دل آتش ز جوش گریہ دریا ست ز گوہر آب را در دل گرہ ہاست

ہوا از دود او شد آتشین رنگ چمن از غنچہ لبریز دل تنگ

چہ می پرسی ز خاک پاک طینت کہ دارد یک جہان گرد کدورت

اگر سنگ است آتش در دل اوست دگر کوہ است دارد نالہ را دوست

تو غافل داغ جان کاہی نداری فروغ شعلۂ آہی نداری

بر آرا ز پردہ ہمچون برق نالہ لباس شعلہ در بر کن چو لالہ

بہارستان داغ و سیل خون شو ز جوش گریہ طغیان جنون شو

دُر اشکی کہ ریزی در عزایش جہان مغفرت باشد سزایش

بگوش دل سخن پرداز گشتم فروغ شعلۂ آواز گشتم

کہ از باد بروت خصم خون خوار بود خاموش شمع نالۂ زار

ترا دو آتش خاموش نالہ زبان داغ است ہمچون برگ لالہ

ز دست فتنۂ بیدار در خواب نمی گردد بہ گرد دیدہ ہا آب

عیان گردیدہ در عہد ستم گر بجای گل قند بر دامن تر

چو طفل اشک در عالم دویدم بجز مژگان سیہ پوشی ندیدم

ز بس پیچیدنم بر خصم بد خواہ چو داغ لالہ در خون شد دلم آہ

فغان مانند دل در خون تپیدہ بجای نالہ جان بر لب رسیدہ

مشہور ہے کہ جب ابراہیم خان ناظم کشمیر آخری مرتبہ کشمیر آئے تو حاجی باب جوان کا رفیق تھا ان کے ساتھ نہیں آیا، اس کے باپ حاجی حیدر نے ملاقات کے وقت ابراہیم خان سے کہا کہ آپ اس مرتبہ بے معنی کشمیر آئے ہیں۔ (۱)

---

(۱) تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۰۹۔

فارسی مرثیوں کا ایک مجموعہ بہت اچھے کاغذ پر نہایت خوش خط طلائی جدولوں کے ساتھ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں معنیؔ کی کچھ اوپر ساڑھے چار سو بیت کی یہ نظم بھی شامل ہے اور اس کا عنوان ہے "واقعه احوال کربلا از حاجی بابا معنیؔ"۔

میر محمد افضل ثابتؔ الہ آبادی:

میر محمد افضل ثابتؔ الہ آبادی بڑا عالی خاندان اور ذی علم شخص تھا۔ اس کا دادا اسلام خان بدخشانی متخلص بہ والاؔ، محمد شاہ کے عہد میں ترقی کرتے کرتے پنج ہزاری منصب اور اکبرآباد کی صوبہ داری تک پہنچا۔ اس کا چچا ہمت خان الہ آباد کا صوبہ دار اور امیر الامرا کے بلند مرتبے پر فائز ہوا، ثابتؔ کی ولادت اور نشو ونما الہ آباد میں ہوئی، کسب علوم کر کے فضیلت کے اعلی درجے تک ترقی کی اور فن شاعری کو کمال تک پہنچایا۔ فارسی زبان پر کامل عبور رکھتا تھا اور تمام اصناف سخن پر قادر تھا۔ ایک مدت تک دہلی میں مقیم اور شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ آخر عمر میں دنیا ترک کر دی اور ۱۱۵۱ھ میں انتقال کیا، "رحیل ثابتؔ" تاریخ وفات ہے۔ مدفن شاہجہان آباد میں ہے۔ (۱) سرو آزاد اور تذکرۂ بے نظیر میں تاریخ وفات ۱۲، ربیع الاول ۱۱۵۰ھ ہے ص ۵۲، ۵۳۔

ثابتؔ فقہ وحدیث میں بڑی مہارت رکھتا تھا اور درویشانہ زندگی گزارتا تھا، شہر کے امرا اور اکابر اس کی تحریم اور توقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ (۲)

ثابتؔ الہ آبادی شعر گوئی، شعر فہمی اور فارسی دانی میں استاد بے نظیر تھا، جمیع اقسام شعر استادانہ کہتا ہے بالخصوص قصیدہ گوئی میں بلند شان رکھتا ہے (۳) اس کے دیوان میں تخمیناً پانچ ہزار شعر ہوں گے۔ (۴)

---

(۱) خزانہ عامرہ، ص ۱۷۳، ۱۷۷۔

(۲) مقالات الشعرا، ص ۲۹، وتذکرہ حسینی، ص ۸۰۔

(۳) سرو آزاد، ص ۲۰۳۔ (۴) مقالات الشعرا، ص ۲۹۔

ثابت نے اوائل شباب میں حضرت علی علیہ السلام کو خواب میں دیکھ کر اپنے اسلاف کے بر خلاف مذہب امامیہ اختیار کر لیا اور اثبات امامت میں ایک کتاب لکھی، آخر عمر میں لباس فقر پہن کر بیشتر اوقات عبادت میں بسر کرنے لگا۔(۱) اپنی عزلت گزینی کے بارے میں کہتا ہے:

بخانۂ نہ نشستم بغیر خانۂ خویش — شدم برنگ نگین سنگ آستانۂ خویش(۲)

مرقع دہلی کے مصنف نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ حیدر آبادی جب دہلی پہنچے ہیں تو ثابت زندہ تھا اور ان کے سامنے ہی اس کا انتقال ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ کل نکتہ سنج ان کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ارباب کمال ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کافی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو وسیلۂ سعادت سمجھتے ہیں، فکر شعر اور کتب صوفیہ کی تالیف کے سوا دوسرے امور کی طرف التفات نہیں کرتے ہیں۔ تمام کتابوں سے انتخاب کر کے علم تصوف میں ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان کی عمر نے اس کے اتمام کے لئے وفا نہ کیا۔ ان کے چند شاگرد اس کے پورا کرنے میں مصروف ہیں۔(۳) ایک مورخ کا بیان ہے کہ اورنگ زیب کے میر بخشی ہمت خان کے بھتیجے میر افضل ثابت الہ آبادی نے جلوس محمد شاہ کے اٹھارہویں سال انتقال کیا۔(۴)

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ ثابت نے واقعات کربلا بھی نظم کئے اور ان میں بہت تلاش سے کام لیا۔ اس کے واقعات مقبل اصفہانی کے طور پر ہیں، ایک واقعے کا مطلع یہ ہے:

محرم است دلا سیل خون زدیدہ ببار — ز شاہ تشنہ لبان آب چشم باز مدار(۵)

---

(۱) خلاصۃ الکلام، بحوالہ معاصر، ص۲، ص ۸۷، ۸۸۔

(۲) نتائج الافکار، ص۱۳۵۔

(۳) مرقع دہلی، ص۵۴۔

(۴) تاریخ مظفری قلمی۔

(۵) خزانہ عامرہ، ص۱۷۳۔

علی ابراہیم خان کا بیان ہے کہ ثابتؔ نے ائمہ ہدیٰ کی مدح میں قصائد۳، اور مصائب امام حسینؑ میں مقبلؔ اصفہانی کی روش پر واقعات کہے۔ لیکن معانی تازہ کی تلاش کے باعث واقعات مقبل کی سی روانی نہیں رکھتا۔(۱)

میرے ذخیرۂ مراثی کی ایک بیاض میں ثابتؔ کے چار واقعات ہیں جن کے مطلع اور عنوان حسب ذیل ہیں:

واقعہ در بیان شہادت امام حسینؑ و وصیت امام زین العابدینؑ:

محرم آمد و گردید حال دھر تباہ کشید تیغ مصیبت ھلال بر سر ماہ

واقعہ در بیان شہادت امام حسین و مشاہدہ نمودن صبیۂ آن حضرت کلاغ خون آلود را و تسلی نمودن زینب آن معصومہ را و بر آوردن شیشۂ تربت:

محرم است دلا سیل خون زدیدہ ببار ز شاہ تشنہ لبان آب چشم بازمدار

واقعہ حضرت امام حسینؑ و بیان شہادت قاسم بن حسن رضی اللہ عنہ:

محرم آمد و چون اھل تعزیت خورشید الف بہ سینۂ خود از خط شعاع کشید

واقعہ حضرت امام حسینؑ صلوات اللہ علیہ:

محرم آمد و گردون بکام غم گردید عزا گرفت شب و روز چون سیاہ و سفید

ثابتؔ واقعات کے شروع میں محرم کی آمد کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں اپنے لئے کربلا پہنچنے، امام حسینؑ کے روضے اور مزار کا طواف کرنے اور کربلا میں دفن ہونے کی دعا کرتا ہے۔

مرثیہ گویوں کے لئے واقعات کربلا کا خاص ماخذ روضۃ الشہدا ہے۔ ثابتؔ نے اپنے ایک واقعے میں جس کا موضوع شہادت حضرت قاسم ہے، یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ بیان روضۃ الشہدا کے مطابق ہے:

---

(۱) خلاصۃ الکلام قلمی بحوالہ معاصر حصہ ۲، ص ۸۸۔

بدان سرم که کند کلك من دم انشا　　سواد قصه مطابق به روضة الشهدا

اسی واقعے کے اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شدت غم کی حالت میں سینے پر الف کھینچنے کا دستور تھا۔

روایت است که چون شاه زاده عبد الله　　بخاك معرکه افتاد همچو پر تو ماه
زداغ حسرت جان سوز قاسم ابن حسنؑ　　بر آتش جگر لاله رنگ زد دامن
الف به سینه کشید از غم برادر خویش　　بخون نشسته چو زخم از فراق همسر خویش

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے بھائی عبداللہ بن حسن کی شہادت پر حضرت قاسم نے اپنے سینے پر الف کھینچا، ایک واقعے میں اپنے دل کو خطاب کر کے محرم میں عزاداری کا سامان کرنے کی فرمائش کرتا ہے اور کہتا ہے بکش بہ سینہ الف ہا بہ داغ پہلو دہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے دنوں میں عزادار اپنے سینے پر الف داغ، کھینچتے تھے۔ ایک واقعے میں کہتا ہے کہ محرم کی آمد پر غم والم کے جو آثار نمایاں ہوئے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ:

فشاند اشك مصیبت زدیده شبنم صبح　　الف به سینه کشید آفتاب از دم صبح

ایک دوسرے واقعے کے مطلع میں اس دستور کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

محرم آمد و چون اهل تعزیت خورشید　　الف به سینهٔ خود از خط شعاع کشید

ان اشعار سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ محرم میں اہل عزا اپنے سینے پر الف یا الف داغ کھینچا کرتے تھے مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا طریقہ کار کیا تھا۔

میر تقی میرؔ کے ایک مرثیے میں بھی الف داغ کھینچنے کا ذکر ہے، یہ مرثیہ اس بند سے شروع ہوتا ہے۔

محرم کا نکلا ہے پھر کر ہلال　　قیامت رہیں گے دلوں پر ملال
کیا تھا جو ماتم بہت پر کے سال　　سو آئے نہیں اب تلک جی بحال

اس مرثیے میں انہوں نے بتایا ہے کہ محرم کا چاند دیکھ کر لوگ عزاداری کا کیا کیا سامان کرتے ہیں۔اس سلسلے میں کہتے ہیں:

الف داغ کھنچے کہیں جائیں گے　　　کہیں نعل سینوں پہ جڑوائیں گے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم میں عزادار اپنے سینے پر الف داغ کھینچتے اور نعل جڑواتے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ نعل کیسے ہوتے تھے اور سینے پر کیونکر جڑے جاتے تھے۔

ثابت کی واقعہ نگاری کے رنگ و آہنگ کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔اس واقعے کا عنوان ہے واقعہ حضرت امام حسین صلوات اللہ علیہ اور اس کا مطلع ہے"محرم آمد و گردون بکام غم گردید"س واقعے میں کل ایک سو دو اشعار ہیں، اس کا جو اقتباس پیش کیا جارہا ہے اس میں انصار و اعزہ کی شہادت کے بعد امام حسین کی بیکسی ،تنہائی اور شہادت، اعدا کا ان کے خیموں میں آگ لگانا، ان کے اہل بیت کو اسیر کرنا اور حضرت زینبؑ کا نعش مبارک پر بین کرنا بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

جد افتاد در آن عرصه شاه دین ز سپاه　　　کسی نماند بجز بیکسی به او همراه

بجز دهان جراحت که آب پیکان خورد　　　کسی کجادم آبی در آن بیابان خورد

شهی که کشتی نوحش رسول حق فرمود　　　روان به بحر فنا خشك لب چو کشتی بود

ز تشنگی به لب آمد چو جان شاه شهید　　　ز دست جور فلك شربت وفات چشید

دلاوری که ز عصمت همیشه جوشن داشت　　　تنش ز زخم جفا صد هزاررو زن داشت

ز بسکه زخم پیاپی به آن شهید رسید　　　زره بـه پیکـر او آبشار خون گردید

نه ریخت خون شهیدان ز حلقهٔ جوشن　　　چکید اشك جگر گون زدیدهٔ آهن

فتاد شور که اتش بخیمه گاه زدند　　　شد آفتاب قیامت بقدر نیزه بلند

دگر بـه نیزه سر شمع راستان کردند　　　زموی گیسوی او پرچم ستان کردند

سر مبارك آن آفتاب صبح امید چگونه ماهچه رایت عدد گردید
پس از شهادت آن سرور ستوده شیم ز اهل شام گروهی تمام ظلم و ستم
به اهل بیت رسول خدا در افتادند به پای بستن اطفال دست بکشادند
چو اهل بیت بقید بلا شدند اسیر فلك نمود چراغان بخانهٔ زنجیر
بقید سلسلهٔ اشك خویش زندانی همه چو سلك گهر در لباس عریانی
گروه بسته بز بخیر کین در آن ظلمات روان شدند به آئین موج آب حیات
بمقتل شهدا ناگهان گزر کردند بحال بیکسی کشتگان نظر کردند
در آن محیط بلا دیدز ینبؑ دل ریش بخون تپیده تن نازنین برادر خویش
برنگ اشك بروی زمین جگر خسته بخون خویش کف خاك را حنا بسته
عدو به آیت قرآن عمل نه کرد بکین فتاده حرف خدا و رسول او به زمین
خطاب کرد به پیغمبر خدا آن گاه که ای شفیع گناهان امت گمراه
حسینؑ تست جدا سرز تن درین صحرا غریب و بیکس و دوراز وطن در ین صحرا
لبی که بالب لعل تو بودهم دستان زبان به سر زنش او کشاده نوك سنان
کسی که وحی بکاشانه اش فرود آمد چرا ز سیل بلا خانه اش فرود آمد
کسی که حلّه فردوس بود برتن او سحاف از پر جبریل داشت دامن او
نشسته است غبار الم بدامانش شده است حلقهٔ گرداب خون گریبانش
امید رحم ز گردون کم پلاسش نیست بغیر دامن صحرا دگر لباسش نیست

دریغ باعث تسکین ما غریبان رفت
سرور سینهٔ مجروح غم نصیبان رفت

ایران میں مرثیہ گوئی کو خاص ترقی کبھی نہیں ہوئی۔ ایرانی ادبیات میں مراثی کو مذہبی تقدس سے قطع نظر کوئی خاص ادبی امتیاز کبھی حاصل نہیں ہوا اور اب تو زمانے کے رجحانات ہی بدل گئے ہیں اور

ایران میں جو فکری انقلاب ہوا ہے اس کی بنا پر آئندہ اس صنف سخن میں کوئی ترقی ہونے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔

ایران کے ایک زبردست شاعر پورداؤد اپنے مرثیوں کو اپنے دیوان میں شامل کرنے کے قابل نہیں سمجھتے بلکہ مرثیہ گوئی کو اپنی شان سے پست جانتے ہیں، اپنے دیوان ''پوراندخت نامہ'' مطبوعہ، ۱۹۲۸ء کے دیباچہ میں اپنے بچپن کی شاعری کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ازین دوره گزشته به مرثیه گوئی افتادم ، بسا از اثر نوحه ، سینه زنی، نگارنده که مرثیه خوانان به آهنگ محزونی می سرودند سینه ها در ماه محرم و صفر در رشت زخمین و خونین شد ۔ (۱)

اسی دیباچے میں آگے چل کر مرثیوں کو دیوان میں شامل نہ کرنے کا سبب یہ بتاتے ہیں:

چون اشعار رشت بیشتر در ماتم و سوگواری بود نه خواستم که از قرأت آنها درین دیوان دل کسی شکسته شود و سیل سرشك از دیدگان مردم جاری نموده واقعۂ طوفان نوح را تجدید کنم، اگر در دنیا از چشمۂ چشم مردم اشك سرد و از تنور دلش آه گرم بیرون کشیدن هنری است ،ارزانی نوحه خوانها باد۔ (۲)

ترجمہ: اس دور سے گزر کر میں مرثیہ گوئی میں پڑ گیا۔ میرے ماتمی نوحوں کے اثر سے جن کو مرثیہ خوان غمگین لحن میں پڑھتے تھے، رشت میں اکثر محرم اور صفر کے مہینوں میں سینے زخمی اور خون آلود ہو جاتے تھے۔

چوں کہ رشت کے اشعار ماتم اور سوگواری میں تھے میں نے نہیں چاہا کہ ان کو اس دیوان میں پڑھ کر کسی کا دل ٹوٹ جائے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری کر کے طوفان نوح

---

(۱) پوراندخت نامہ، دیباچہ، ص ۱۰۔

(۲) پوراندخت نامہ، دیباچہ، ص ۱۱۔

کے واقعے کی تجدید کروں، اگر دنیا میں لوگوں کی آنکھوں سے ٹھنڈے آنسوؤں کا چشمہ جاری کرنا اور ان کے دل سے گرم آہیں نکالنا کوئی ہنر ہے تو روضہ خوانوں کو مبارک رہے۔

ایران کے اخبار ''مہر منیر'' نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اخبار ''سرفراز'' کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کے سلسلے میں لکھا:

> از لکھنو مرکز ایالت اوده و مسقط الراس شعرای نامی هندوستان و محل نشوو نمای بلبلان هزارا دائی در مرثیه سرائی مثل مرحوم میر انیس و مرحوم میرزای دبیر طاب ثراهم دو مرثیه سرایان ایران ما غیر ازمرحوم محتشم کاشانی و مرحوم وصال شیرازی رحمة الله علیهم مثل و نظیری برای آنان موجود نیست۔(۱)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ لکھنو میں ہندوستان کے نامی شاعر پیدا ہوے اور میر انیسؔ اور میرزا دبیرؔ کی نشو ونما ہوئی جو مرثیہ گوئی میں بلبل ہزار داستان تھے، ایران میں محتشمؔ کاشانی اور وصالؔ شیرازی کے علاوہ کوئی مرثیہ گوان کا مثل ونظیر نہیں ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے استاد فارسی آقای امیر عباس حیدری کا ایک مقالہ ''انیسؔ بزرگ ترین مرثیہ گو'' کے عنوان سے ماہنامہ دانش تہران میں شائع ہوا، انہوں نے میر انیسؔ کے چند شعروں، بندوں اور متعدد رباعیوں کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا ہے اور لکھا ہے:

> مرثیه سرائی هیچ وقت در ایران جلوه نه کرده است، ایرانی خوش ذوق و نکته سنج که گوش و دل او با نغمات پر وجد حافظؔ و خیامؔ آشنا ست، ذوق سلیمش مرثیه پسند نمی

---

(۱) اخبار سرفراز لکھنو مورخہ ۲۸، اکتوبر ۱۹۲۶ء۔

تواند باشد ، در سراسر حیات ادبی ایران کم تر به اسم یک مرثیه سرای بزرگ بر می خوریم و سوای ترجیع بند محتشم کاشانی مرثیه ای که چنگی به دل زند و حالی داشته باشد در دست نه داریم۔(۱)

ترجمہ:

ایران میں مرثیہ گوئی کو کسی وقت میں فروغ نہیں ہوا، خوش مذاق اور نکتہ سنج ایرانی جس کے کان اور دل حافظؔ اور خیامؔ کے وجد آفرین نغموں سے آشنا ہیں، اس کا ذوق سلیم مرثیہ پسند نہیں ہوسکتا، ایران کی پوری حیات ادبی میں کوئی بڑا مرثیہ گو ہم کو بہت کم ملتا ہے اور محتشم کاشانی کے ترجیع بند کے سوائے ہمارے پاس کوئی ایسا مرثیہ نہیں ہے جس سے دل پر چوٹ لگتی ہو اور کوئی کیفیت رکھتا ہو۔

تمام شد

(۱) ماہنامہ دانش، تہران، جنوری ۱۹۵۱ء۔

فہرست مآخذ

تاریخ ادبیات ایران، جلد اول، از پروفیسر براؤن۔

فارس نامہ، از ابن البلخی، مطبع کیمبرج یونیورسٹی، ۱۹۲۱ء۔

قابوس نامہ، از عنصر المعانی گیکاوس، مطبع میر محمد باقر تہرانی، ۱۲۸۵ھ ش

تاریخ تمدن اسلامی، از جرجی زیدان۔

روضۃ الشہدا، از ملا حسین واعظ کاشفی، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۸۹۱ء۔

سیاست نامہ از نظام الملک طوسی۔

مجالس المومنین، از قاضی نور اللہ شوشتری۔

فتوح البلدان، طبع لیدن، ہالینڈ۔

دیوان ناصر خسرو علوی، مطبع مجلس، تہران، ۱۳۰۴ھ، ۱۳۰۷ھ۔

نزہۃ القلوب، از حمد اللہ مستوفی، مطبع بریل، لیدن، ۱۹۱۳ء۔

دول الاسلام، علامہ ذہبی۔

العبر فی احوال من غبر از علامہ ذہبی۔

تاریخ ادبیات ایران، جلد دوم، از پروفیسر براؤن۔

ہفت اقلیم، از امین احمد رازی۔

مقامات حمیدی، از قاضی حمید الدین ابو بکر بلغی، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۳ء۔

حدیقۃ الحقیقۃ، از سنائی غزنوی، مطبع میرزا ابوطالب شیرازی، بمبئی، ۱۸۵۹ء۔

خسرونامہ (ہرمز و گل رخ) فریدالدین عطار، مطبع ثمر ہند، لکھنؤ ۱۸۷۷ء۔

تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی مرتبہ پروفیسر براون، مطبع بریل، لیدن، ہالینڈ۔

نفحات الانس، از ملا جامی، مطبع سیدی، بمبئی ۱۲۸۴ھ۔

کتاب منظوم در معجزات ائمہ (قلمی) کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی۔

بیاض قلمی در روایات و مراثی وغیرہ، مرتبہ عہد آصف الدولہ فرمان روائے اودھ، کتب خانۂ راقم۔

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔

طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد ہروی، طبع کلکتہ، ۱۹۱۳ء

لطائف للطوائف، از علی بن حسین واعظ کاشفی (قلمی) کتب خانۂ راقم۔

خزانۂ عامرہ، از علامہ آزاد بلگرامی۔

صحف ابراہیم، از علی ابراہیم خان خلیل (قلمی) مشرقی کتب خانہ، پٹنہ۔

خلاصۃ الاشعار، از تقی الدین محمد حسینی کاشانی۔

مجمع الفصحا، از رضا قلی خان ہدایت طبرستانی۔

تاریخ عالم آرائے عباسی، از اسکندر منشی، مطبوعہ تہران، ۱۳۱۴ھ۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات، از نصیر الدین ہاشمی۔

تزکِ بابری۔

شعرائے ایران، (بزبان انگریزی) از سر گور آوسلی۔

مجالس النفائس، از میر علی شیر نوائی، (ترجمہ فارسی) مرتبہ علی اصغر حکمت، مطبوعہ تہران، ۱۳۲۳ھ.ش
مقدمہ، مجمع النفائس۔

تاریخ ادبیات ایران، جلد سوم، از پروفیسر براون۔

تحفۂ سامی، از سام میرزا صفوی۔

روضات الجنات فی تاریخ مدینۂ ہرات، از معین الدین محمد اسفزاری۔

حبیب السیر، از خواند میر۔

تاریخ اسلام، از محمد احسان اللہ، ۱۸۹۵ء۔

لباب الالباب، از محمد عرفی۔

حزن المومنین، شیخ محمد علی، مطبع محمدی، بمبئی، ۱۲۹۱ھ۔

تذکرہ شعرا از طاہر نصر آبادی، مطبع ارمغان، تہران، ۱۳۱۷ھ.ش

روضۃ الشہدا (دکنی) از ولی ویلوری۔

خلاصہ روضۃ الشہدا، موسوم بہ دہ مجلس (قلمی)۔

کربل کتھا، معروف بہ روضۃ الشہدا، از فضلی۔

ریاض الشعرا، از والہ داغستانی۔

آتش کدہ، از لطف علی بیگ آذر اصفہانی۔

احسن التواریخ۔

آئین اکبری، از ابوالفضل۔

کلیات محتشم کاشی (قلمی)۔

دیوان محتشم کاشی (قلمی)۔

شمس الضحیٰ۔

مجموعۂ مراثی فارسی، از محمد تقی علی خان، مطبع نول کشور، لکھنو، ۱۸۹۰ء۔

مخزن الغرائب، آذری اسفرائنی (قلمی)۔

کلیات خاقانی، مطبع نول کشور، لکھنو۔

ذخیرۂ مناقب، مطبع یوسفی، دہلی، ۱۹۲۲ء۔
راحت الصدور، از محمد بن علی بن سلیمان راوندی، مطبع بریل، ہالینڈ، ۱۹۲۱ء۔
مجموعۂ مراثی ۲، قلمی، کتب خانۂ راقم۔
حبیب الاوصاف، سید حبیب اللہ حبیب کردستانی، مطبع محمد ابراہیم بک۔
انیس العرفا، درویش سلیمان کرمانی، مطبع گلزار حسنی، بمبئی، ۱۳۲۳ھ۔
کلیات شباب، ملا عباس شباب شوستری، طبع بمبئی، ۱۳۱۲ھ۔
طوفان البکا، میرزا محمد ابراہیم جوہرؔی۔
منظومات ترکی شیرازی، ۱۳۰۹ھ۔
مفتاح البکار، ترکی شیرازی، مطبع گلزار حسنی، بمبئی، ۱۳۱۸ھ۔
جواہر الزواہر، میرزا حسین معتقد بوشہری، بمبئی، ۱۳۰۹ھ۔
مفرح الفواد و مبکی العباد، حاجی سید محمد محسن رجائی شیرازی، مطبع گلزار حسنی، بمبئی، ۱۳۲۴ھ۔
دیوان فتح علی شاہ قاجار متخلص بہ خاقانؔ۔
دیوان ناصری، ناصر الدین شاہ قاجار، شائع کردہ میرزا محمد ملک الکتاب شیرازی۔
اسرار الشہادت، اسمٰعیل خان سرباز بروجردی، کارخانہ آقا محمد، یزد، ۱۲۷۵ھ۔
کلیات جودی، میرزا عبدالجواد جودی خراسانی، مطبع مظفری، بمبئی س ۱۳۴۳ء، ایک نسخہ ۱۲۹۹ھ، مطبع علمی، ۱۳۵۱ھ۔
حیات ناصر الدین شاہ ایران، محمد عبدالعلی، مطبع خادم الاسلام، دہلی، ۱۸۹۷ء۔
عذب البیان، محمد حسین، مطبع حسینی، رام پور، ۱۸۷۲ء، و مطبع اگرہ اخبار، آگرہ، ۱۹۲۴ء۔
زبدۃ الکوائف، مہاراجا جے گوپال ثاقبؔ۔
قیصر التواریخ جلد اول، سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی۔
لالۂ بوستان، میرزا محمد خان نصیبی کرمانی۔

کلیات وصال شیرازی۔

دیوان صاحب، میرزا محمد تقی علی آبادی

کلیات خرم شیرازی، میرزا ابوالحسن خرم شیرازی، مطبع مظفری، بمبئی، ۱۳۲۸ھ۔

مخزن الدرر، ملا حسین حقیر دزفولی، طبع بمبئی، ۱۳۰۵ھ۔

دیوان وفائی، ملا فتح اللہ وفائی شوستری، مطبع گلزار حسنی، بمبئی، ۱۳۱۱ھ۔

واقعات ملا مقبل وغیرہ، نواب محمد تقی علی خان کربلائی، مطبع نول کشور، لکھنو، ۱۳۰۷ھ

واقعات ملا خطا، نواب محمد تقی علی خان کربلائی، مطبع نول کشور، لکھنو، ۱۳۰۷ھ

مجموعۂ مراثی خاکی، میرزا محمد ابراہیم خاکی شیرازی، طبع بمبئی، ۱۳۰۶ھ۔

مراثی وصال شیرازی، ۱۳۵۵ھ۔

مراثی وصال شیرازی، طبع، بمبئی۔

جنگ المناقب والمصائب، کارخانہ علی قلی خان قاجار، ۱۳۰۰ھ۔

دیوان وفا، حاجی حسین علی خان نوری وفا طبع تہران، ۱۳۲۲ھ۔

محیط العزا، فضل علی اصفہانی، تاریخ ختم کتاب ۱۲۲۲ھ۔

تجلیات روح ایرانی، حسین کاظم زادہ۔

خلاصۃ الافکار، ابوطالب۔

تاریخ ابن کثیر شامی۔

مجموعۂ مراثی فارسی (قلمی) خوش خط مطلا، کتب خانہ راقم۔

مجموعۂ مراثی فارسی (قلمی) ناقص الاول، مورخہ ۲، ربیع الثانی، ۱۲۵۳ھ بقلم سید عسکر حسینی۔

بیاض مراثی ملا مقبل وغیرہ، بیاض کلاں مشتمل بر مراثی مقبل وغیرہ، ناقص الاول (قلمی)۔

بیاض روایات، نوحہ جات و مراثی وغیرہ (قلمی) کتابت بعہد آصف الدولہ فرماں روائے اودھ۔

کتب خانہ راقم۔

دہ مجلس فارسی، نوشتہ میر محمد حسین، مورخہ ماہ صفر ۱۲۵ھ جلوس شاہ عالم بادشاہ، کتب خانہ راقم۔

بیاض روایات و نوحہ جات و مراثی وغیرہ (ناقص الطرفین) کتب خانہ راقم۔

تحفۃ العالم، میر عبداللطیف خان شوشتری۔

دستور الفصاحت، احد علی خان یکتا لکھنوی۔

تاریخ اودھ، نجم الغنی خان رام پوری۔

اخبار ماتم۔

بحر البکا۔

ریاض الفصحا، غلام ہمدانی مصحفی۔

خلاصۃ الکلام، علی ابراہیم خان خلیل (قلمی) مشرقی کتب خانہ پٹنہ۔

تذکرۂ بے نظیر۔

سرو آزاد، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی۔

نتائج الافکار۔

تذکرۂ حسینی، حسین دوست سنبھلی۔

مرقع دہلی۔

تاریخ مظفری۔

بیاض واقعات ثابت الہ آبادی (قلمی) محمد افضل ثابت الہ آبادی۔

ماہ نامہ دانش، تہران، جنوری، ۱۹۵۱ء۔

روز روشن۔

مجموعہ ہفت بندہا۔

فہرست مطالب:

احوال واقعی

پروفیسر نیر مسعود (سابق صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

ایران میں مرثیہ نگاری یہ ہمارے والد صاحب نے بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ مگر نہیں معلوم اس کے ساتھ کیا منحوسیت لگ گئی کہ وہ اب تک چھپ نہیں سکی۔ حالانکہ اس کی طباعت سے بہت سارے لوگوں کو دلچسپی تھی۔ کرنل بشیر حسین زیدی، مالک رام اور دیگر بزرگ شخصیات اس کے چھپنے کے بے حد منتظر تھے۔ اب امید ہے کہ محبان ام الائمہ تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ کی جانب سے یہ عظیم الشان کتاب منظر عام پر آجائے گی۔ یہ ادارہ مذہبی اور ادبی خدمات بے لوث انجام دے رہا ہے۔ اس کا ششماہی مجلہ ام الائمہ خود ایک علمی ادبی سرمایہ ہے۔

امید ہے کہ آئندہ اور ترقی کے مراحل طے کرے گا جن لوگوں کو اس کتاب کی اشاعت کے حوالہ سے بڑی دلچسپی تھی وہ سب رخصت ہوگئے اب موجودہ نسل کے سامنے والد ماجد کی یہ عظیم محنت منظر عام پر آرہی ہے۔ جو یقیناً علم دوست اور ادبی ذوق رکھنے والے افراد کے لئے ایک علمی ادبی سرمایہ ہوگا۔

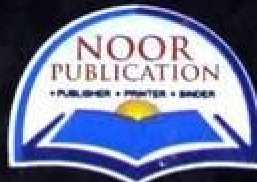
میں بھی بستر علالت پر داعی اجل کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوں۔

طالب دعا: **پروفیسر نیر مسعود**

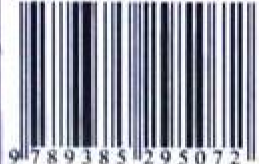


Head Off : Babe Raza, Moh. Mughalpura, Dorukhi, PATNA CITY 800008 BIHAR
Tel : +91-612-2631280, +91-9430604573 E-mail : m_ummulaimma@yahoo.com

Published by :



Kucha Chellan, Darya Ganj, New Delhi-2



₹ 280/-